

پاک ہند کی چند اسلامی تحریکیں

اور

علماء حق

انہر

خلیل اشرف صاحب عظمی قادری

بالمہمل

ابوالعطاء حافظ نعمت علی چشتی سیالوی

ناشر

مکتبہ نریدریہ جناح روڈ سیال

پاک و ہند کی چند اسلامی تحریکیں

اور

علمائے حق

انر

خلیل اشرف صاحب عظمیٰ قادری

بالمہملہ

ابوالعطاء حافظ نعمت علی چشتی سیالوی

ناشر

مکتبہ نوریہ جہان روڈ سیال

انتساب

اسلام کے اُن جگہ گاتے ستاروں
 کے نام جنہیں تعصب کے
 اندھیروں میں دھکیل دیا گیا۔

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب _____ اسلامی تحریکیں

مصنف _____ علامہ خلیل اشرف صاحب اعظمی

ضخامت _____ ۲۰۲ صفحات

تعداد _____ ایک ہزار

ناشر _____ مکتبہ فریدیہ سیوال

قیمت _____

آرٹ بائیڈنگ : پنجاب بائیڈنگ سنٹر۔ دربار مارکیٹ لاہور
 براہتمام نسیم کاشمیری

فہرست مضامین

صفحہ نمبر	نام عنوان	صفحہ نمبر	نام عنوان
۸	کتاب سے پہلے کتاب اللہ کا مطالعہ کیجئے	۳۴	ابن عبد الوہاب اور برطانوی جاسوس ہمفرے
۱۱	سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا	۴۰	جہاد اور جہادی
۱۲	اظہار حقیقت اور مقام عبرت	۴۲	تضادات
۱۳	حرف اول	۴۰	پروپیگنڈے کی خوفناک کہانی محمد علی قصوری
۱۴	عقیدت نے تاریخ کو مسخ کر دیا	۴۳	کی زبانی
۱۴	مورخ کی برہمی	۴۳	دلچسپ باتیں
۱۶	جہاد کا نصب العین	۴۵	مولوی محمد اسماعیل کا عزم خورشیدی
۱۷	مقصد جہاد کی ایک اور کہانی	۴۷	دہلی کی کہانی کہنیا لال کی زبانی
۲۰	بات شخصی حکومت کی	۴۹	گوروں کی سرپرستی
۲۱	قبروں کا استیصال	۵۳	انگریز یا سکھ
۲۴	جہاں شریعت کی فرمانروائی ہے	۵۵	اعتراض کا جواب تلوار ہے
۲۶	ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا	۵۷	شیخ اکرام کی گواہی
۲۸	چوہدری حبیب احمد اور نیشنلسٹ علماء	۵۶	ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں
۳۰	اہل قلم کی بے انصافیاں	۵۷	حیرت انگیز انکشاف
۳۱	زود فراموش قوم کا فہرستہ عظیم	۵۷	عقائد و نظریات کی اہمیت
۳۲	معاندانہ طرز عمل	۵۸	اختلاف کا پہلا بیج
۳۲	تذکرہ نویسوں کی چشم پوشی	۶۱	بنیادی نقطہ نظر کا اختلاف
۳۳	بوش و باہریت	۶۲	جواب فتویٰ
۳۳	بیدرمانہ انداز تحریر	۶۳	منظر بازی

صفحہ نمبر	نام عنوان	صفحہ نمبر	نام عنوان
۶۲	یک طرفہ کاروائی	۶۲	نتائج
۶۳	ایک ہی کتبہ کے لوگ	۶۶	جنگ حریت - حیرت انگیز باتیں
۶۶	یہ بھی مجاہدین ہیں	۶۸	مولانا مہر کی تادیل
۶۸	مؤرخین کی ہٹ دھرمی	۶۸	میاں محمد کی سنئے
۶۹	ہم کیا سمجھیں	۶۹	لفظ سرکار کے معنی
۷۰	مولانا مدنی کی منطق	۷۰	جواب چاہئے
۷۱	مقصد جہاد کی وضاحت	۷۱	مالخویلیا کے مریض
۷۳	جناب بنگلوری فرماتے ہیں	۷۳	زلزلہ
۷۴	چال باز گورے	۷۴	جماعت دیوبند ہر سہرا اپنے سر سجا چکی آرزوم
۷۵	مجاہدین کا پہلا، دوسرا، تیسرا دور	۷۵	مند ہے
۷۷	مولانا ولایت علی کی لاہور میں آمد	۷۷	تحریک خلافت دور خزان
۷۹	مجاہدین کی دعوتیں اور پیٹھ کو روانگی	۷۹	کچھ انجمنیں - کچھ کشیاں
۷۹	بڑے حضرت کا الہام اور چھوٹے حضرت کی تادیل	۷۹	مسلم لیگ کا قیام
۸۰	عبداللہ سندھی اور شیخ اکرام کی گواہی	۸۰	تحریک خلافت اور چند دوسری تحریکیں
۸۲	ازمشاہدات کابل دیا غستان	۸۲	تحریک خلافت کا تاریخی پس منظر
۸۳	مجاہدین کا بیت المال	۸۳	تحریک خلافت اور اس کا رد عمل
۸۴	امیر نعمت اللہ اور سپاہیوں کی بیٹیاں	۸۴	قائد اعظم کی مایوسی
۸۴	ایک اور اندوہناک انکشاف	۸۴	گاندھی کا حکم
۸۵	شہر مناک ہتھکنڈے	۸۵	گاندھی جی کی قیادت اور اس کا صلہ
۸۷	انگریزوں کے دوست	۸۷	دیوانگی کی انتہا
۸۸	غلامی کی فحشرہ پیشکش	۸۸	سیدنا امام احمد رضا
۸۹	سرکار پرستی اپنے عروج پر	۸۹	ہندو مائرم

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
۱۲۰	قومی شخص کی پامالی	۱۲۰	تمام مشرکین ہندو عمارت بالفصل میں
۱۲۲	تحریک ترک موالات اور ہندو مسلم اتحاد	۱۲۲	بریلی میں ابو الکلام آزاد کا کھلا اجلاس ودم
۱۲۳	احوال و واقعات	۱۲۳	صدر الشریعہ کا اتمام حجت نامہ
۱۲۴	حقائق و شواہد	۱۲۴	موالات کی تقسیم اور اسکے احکام
۱۲۵	ہلاکت خیر تحریک	۱۲۵	کافروں، مشرکوں، منافقوں سے بھائی چارہ
۱۲۶	محمد علی جناح اور محمد علی جوہر کی جھڑپ	۱۲۶	کافروں سے اتحاد کا حکم اور مولانا اشرف علی
۱۲۷	جھڑپ کی مزید تفصیلات	۱۲۷	کا اقرار
۱۲۸	مولانا مدنی کا غلو	۱۲۸	مولانا اشرف علی تھانوی کی گواہی
۱۲۹	علامہ اقبال اور ترک موالات	۱۲۹	امام احمد رضا فرماتے ہیں
۱۳۰	کھدیو پٹشی کی ایک اور کہانی	۱۳۰	مولانا تھانوی کو کیا کہینگے ؟
۱۳۱	گاندھی جی کی درگت	۱۳۱	تحریک ہجرت دور جنوں
۱۳۲	مشارع عظام، علمائے کرام	۱۳۲	ہلاکت آفرین کلمات
۱۳۳	درباؤں کے دل جس دہل جائیں وہ طوفان	۱۳۳	تحریک ہجرت کی کہانی
۱۳۴	امام احمد رضا علیہ الرحمہ فرماتے ہیں	۱۳۴	نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم
۱۳۵	ایک سپاہی کی ضرب	۱۳۵	مجدد وقت کا اظہار حق
۱۳۶	امام احمد رضا علیہ الرحمہ فرماتے ہیں	۱۳۶	تسلو رکون اٹھائیگا
۱۳۷	دید و شنید	۱۳۷	ڈاکٹر مونجے کا نظریہ
۱۳۸	موالات ہر کافر سے حرام ہے	۱۳۸	ہر دیال کی وضاحت
۱۳۹	معاملت کا جواز	۱۳۹	ظفر احمد ایک کی گواہی
۱۴۰	ذ آفاق بہترین انجام اچھا	۱۴۰	سیرت امیر ملت سے
۱۴۱	موالات و معاملات	۱۴۱	دربار عالیہ گورنر مشریت
۱۴۲	مولانا ظفر علی برہم ہو گئے	۱۴۲	جناب شوہر شمس کا ذاتی تجربہ

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
۱۸۹	جہاں نثار ان اسلام	۱۸۹	علامہ شرقی کا ہونناک انکشاف
۱۹۰	کردار کی ایک اور جھلک	۱۹۰	سیاسی میدان میں مسلمانوں کی مکمل شکست
۱۹۱	مسئلہ ذبیحہ گاؤ	۱۹۱	باضابطہ خاتمہ
۱۹۲	رہنمایان قوم کے بیانات	۱۹۲	مولانا علی ندوی کا ارشاد
۱۹۳	برادران وطن کا نظریہ	۱۹۳	ہندو مسلم اتحاد کے خوفناک بچے -
۱۹۴	سیدنا امام احمد رضا اور مسئلہ ذبیحہ گاؤ	۱۹۴	ترک ذبیحہ گاؤ، شدھی، شنگٹھن
۱۹۵	مسئلہ اہلسنت اور اہل بیت سے محبت	۱۹۵	غم و اندوہ کی طویل داستان
۱۹۶	نورالتوحہ ترمی زن	۱۹۶	شدھی کی تحریک
۲۰۰	بے پناہ جرات کا مظاہرہ	۲۰۰	شنگٹھن
۲۰۱	مہر شادی صدر الشریعہ	۲۰۱	محمد علی جوہر کی سوچ
۲۰۲	حسرت آخر	۲۰۲	علی برادران کی واپسی
۲۰۳		۲۰۳	علمائے اہلسنت کا کردار

کتاب سے پہلے کتاب اللہ کا مطالعہ کیجئے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

غور سے سنئے

قَدْ يَرْجُو عَذَابَ الَّذِينَ يَسْتَعِجُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ
أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ ذَاوَالْكَذِبِ هُمْ أُولُوا الْأَلْبَابِ

پ ۲۳ سورہ الزمر آیت نمبر ۱۷، ۱۸

خوشخبری دوسیرے ان بندوں کو جو کان لگا کر بات سنتے ہیں پھر سب
میں بہتر کی پیروی کرتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی۔ اور یہی عقل
والے ہیں۔

کافروں سے دوستی

تَرَى كَثِيرًا مِنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ
لَهُمْ أَنْفُسُهُمْ أَنْ سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُونَ
وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوا
أُولَٰئَاءَ وَلَٰكِنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ فَسِقُونَ ۝

پ ۶ سورہ المائدہ آیت نمبر ۸۰، ۸۱

تم ان میں بہت سے لوگوں کو دیکھو گے کہ کافروں سے دوستی کرتے ہیں بیشک
کبھی بڑی چیز ہے جو خود انہوں نے اپنے لئے تیار کی یہ کہ ان پر اللہ کا عذاب اتنا
اوردہ ہو کہ عذاب میں رہیں گے۔ اور اگر انہیں اللہ و نبی و قرآن پر ایمان ہوتا

تو کافروں کو دوست نہ بناتے۔ لیکن ان میں بہت سے فاسق ہیں۔

اگر چہ اپنے ہی ہوں

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَ
رَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ

پ ۲۸ سورہ المجادلہ آیت نمبر ۲۲

تم نہ پاؤ گے ان لوگوں کو جو یقین رکھتے ہیں اللہ اور پچھلے دن پر کہ دوستی کریں ان سے
جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے مخالفت کی اگرچہ وہ ان کے باپ یا بیٹے
یا بھائی یا کنبے والے ہوں۔

ممنوع ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ
إِلَيْهِمُ بِالْمُودَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ

پ ۲۸ سورہ الممتحنہ آیت ۱

اے ایمان والو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم انہیں نہیں چہانتے
جو دوستی سے حالانکہ وہ منکر ہیں اس حق کے جو تمہارے پاس آیا۔

کافروں کے دوست خدا کے دوست نہیں

لَا يَتَّخِذُ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ مَن
يَفْعَلْ ذَلِكَ فَكَيْسٌ مِنَ اللَّهِ فِي شَأْنِهِ ۝

پ ۳ سورہ آل عمران آیت نمبر ۲۸

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
حَبِيبِ أَوَّلِ

مدلول سے یہ خواہش تھی کہ کوئی ایسی کتاب لکھی جاتی جس میں دلربان ہند کی "تحریکِ جہاد"، اور تحریکِ آزادی ہند ۱۸۵۷ء سے لیکر "تحریکِ قیام پاکستان"، تک کے احوال و واقعات کا حقائق و شواہد کی روشنی میں بے لاگ ادھر پور تجزیہ ہو تا۔ بہ صورتِ کتاب "پاک دھند کی چند اسلامی تحریکیات اور علما نے حق حاضر ہے۔ اسکے بہت سے مندرجات قائدین کو حیرت انگیز معلوم ہونگے۔ مگر کیا کیا جائے کہ یہ تمام جو خفاک باقی خود گھر کے" مؤرخین نے تحریر فرمائی ہیں۔

آپ شاید اندازہ بھی نہ فرما سکیں کہ اس قسم کے مصروفیات پر قلم اٹھانا بیل ہرطایار کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔
راقم کو بڑے جاگہ حالات سے گزنا پڑتا ہے۔ الجھی ہوئی گتھیاں سلجھانے میں نہ جانے کتنی راتیں گزرجاتی ہیں
اور باتیں دہیں رہتی ہے۔ حوالوں کی تلاش و جستجو ایک مستقل صبر آزمائے مسئلہ بنتا ہے۔ اور انتہائی دردناک
لمحات وہ ہوتے ہیں جب ناکو وہ گناہوں کے الزام میں جذبات کو محسوس پہنچتی ہے اور اہل قلم کی بے انصافی
پر قلم اٹھانے لگتا ہے۔ اس وقت رہو اراقم کو سنبھالنا بڑا ہی دشوار مرحلہ بنتا ہے۔
حال یہ کہ یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجئے

اک آگ کا دیبا ہے اور تیر کے جانا ہے

عقیدت نے تاریخ کو مسخ کر دیا { ان حقائق کے باوجود کہ تحقیقات کسی کی جاگہ نہیں دنیا کے ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی موضوع پر بھی تحقیق کر سکتا ہے۔ جناب مسعود عالم ندوی اور ان جیسے اہل قلم خاصے برہم نظر آتے ہیں۔ چنانچہ خود جناب مسعود عالم صاحب ندوی اپنی کتاب ”ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک“ میں جناب ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ”میرت سیار احمد شہید“ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

مگر افسوس ہے کہ میرے عزیز ترین دوست اور میرے بھائی کا طریقِ نظر و فکر خاص عقیدت مندانہ ہے اور انہوں نے بزرگوں کی کوتاہیوں اور فرگذاشتوں سے نگاہ بیکار نہ کی جانی کو بخشش کی ہے۔

— دوستِ ستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۱۵۱

(۵) اعلیٰ حضرت نے مولانا عبد الباقی فاضل دیوبند (رحمۃ اللہ علیہ) کو خطوط لکھے اور انہیں کہہ کر مسلمان حرا و عتدال سے بڑھ گئے ہیں۔ ان سے بچنا چاہئے۔ اسی طرح مولانا شکرت علی کو لکھا کہ لاگرتے ہو تو اسلام ترک نہ کرو اور اصولوں پر قائم رہو!

(امام احمد رضاؒ، ہفت روزہ افغان کراچی ۲۹-۲۵ فروری ۱۹۷۸ء)

مورخ کی برہمی

اور کیا یہ ممکن نہیں کہ وہی عقیدت و ارادت خود جناب مسعود عالم صاحب پر بھی غالب ہو! بلکہ کتاب ”ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک“ کے مطالعہ کے بعد یہ امکان یقین میں بدل جاتا ہے۔ اور کتاب کے لب و لہجہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خود جناب مسعود عالم صاحب عقیدت و ارادت کی کس منزل پر کھڑے ہیں۔

ایک طرف ان نفوس قدسیہ کی قربانیاں اور فداکاریاں ہیں اور دوسری طرف ہندوستان کے بے شرم مسلمانوں کی طرف سے ”تکفیر و تفسیق“ کا صدمہ سالہ لٹریچر جو بدایلوں سے مدد اس تک پھیلا اور اب تک پھیلا جا رہا ہے ”نواب تکفیر کی تلوار کنہ پوچھی ہے“ خانقاہوں میں بیٹھ کر جو گریوں کی طرح مالا جیسے ولے ”سید احمد اور اسماعیل شہید“ جیسے مجاہدین امت پر کفر کے فتوے لگائے گئے ہیں۔ اور بد نصیبی یہ ہے کہ ان بد بختوں نے آج تک ان نیک بندوں کو معاف نہیں کیا۔

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۳۶

اور اس عبادت کا حاشیہ بھی بطور وضاحت ملاحظہ فرماتے چلیں

ان لوگوں کو بد بخت کے علاوہ اور کیا کہا جائے ریگ کے تودے کو کوہ دماوند کہنا راقم کے بس کی بات نہیں اور اگر یہ جرم ہے تو عاجز کو اس کا اعتراف ہے (حوالہ مذکور)

اور اس کتاب کے صفحہ پر تو جناب ندوی کی برہمی اور نازک مزاجی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور ثقافت کا مقدس خول اُترتا ہوا نظر آتا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں

باطل کو حق کہنا، یا اس کے مقابلے میں مدارات و مدارات سے کام لینا راقم کے بس سے باہر ہے ہم باطل کو بہر حال باطل کہیں گے خواہ دنیا والوں کو اچھا لگے یا بُرا بندہ حق کیلئے ”تودہ ریگ“ کو کوہ دماوند کہنا بہت مشکل ہے رسالہ جامعہ کے تبصرہ نگار نے زبان اور طرز انشا کی ”سوقیت“ کی شکایت کی ہے۔

افسوس کہ ہم اس سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ باقی اپنا اپنا ذوق ہے

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۵۷

اب ندوی صاحب ہی ارشاد فرمائیں کہ ان حالات کے پیش نظر ان کے خود ساختہ ”تودہ ریگ“ کے کوہ دماوند کو کوہ دماوند کون کہے گا حق گوئی و حق پرستی میں دوسرے لوگ کچھ کم تو نہیں ہیں۔ اب اسے کیا کہا جائے کہ جناب ندوی کو دوسروں کی راست گوئی بھی نہ معلوم ہوتی ہو۔۔۔ جناب ندوی اپنی اس کیفیت کے متعلق خود ہی لکھتے ہیں۔

لیکن اپنی اس بد نصیبی کا نام کن لفظوں میں کیا جائے۔ دل میں ایک ہو کہ اٹھتی ہے اور آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے جب کسی ملال کے فتوے اور خواتین سرحد کی عذاری یاد آتی ہے۔

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۳۲

کیا جناب ندوی کو علم نہیں کہ جب برہمی اور بغض و غضب سے آنکھوں میں خون اُتر آئے تو بصارت ختم ہو جاتی ہے اور بصیرت کا بھی کہیں دور دور پتہ نہیں چلتا۔ ظاہر ہے کہ ایسے مغلوب الغضب شخص سے کسی دانشمندی اور عدل و انصاف کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

علم و حلم کا تقاضہ تو یہ ہے کہ فرقہ ثانی کے نظریات بھی سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اور فراہمی کیساتھ اسکے استدلال پر بھی غور کیا جائے صرف اپنی ہی کہے جانا اور کسی کی نہ سنا کوئی معقول بات نہیں ہے ”مگر یہاں تو اپنا اپنا ذوق ہے“ کا عمل دخل ہے۔ ان حالات میں خیر جانبدارانہ تحقیق اور منصفانہ گفتگو کی کہاں گنجائش باقی رہتی ہے جناب ندوی خود ہی لکھتے ہیں۔

راقم کا عجیب حال ہے جہاں مجاہدین راہ حق کا ذکر آیا دہم اگلی اور پھیلی بے انصافیاں اور غلط بیانیوں ایک ایک کر کے یاد آنے لگتی ہیں۔ جو ارباب ہواؤ ہو سس نے ان بزرگوں کے متعلق روارکھی ہیں اور رہو ارقم بے قابو ہونے لگتا ہے کتاب مذکور ص ۵۱

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا ندوی کے ان بزرگوں کے متعلق کن لوگوں نے افواہیں اُڑائی ہیں اور کن لوگوں نے غلط بیانیوں کی ہیں۔ اور کیوں۔

اس باب میں ہم علی رؤس الاشہاد کہہ سکتے ہیں کہ مجاہدین کے سوانح نگار اور تذکرہ نویس تاریخ مجاہدین سے لیکر پہلی اسلامی تحریک اور اس سے ماقبل و مابعد تقریباً سبھی سید صاحب و مولوی

محمد اسماعیل صاحب ہی کے مداح اور ثنا خواں تھے۔

چنانچہ جناب شیخ محمد اکرام موج کوثر میں اس کا اعتراف فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اس افسوسناک انقلاب احوال کا تجربہ یہ کرنا اور اسکے اسباب و بواعث ڈھونڈنا تاریخ نگار کا تلخ فرض ہے۔ لیکن آج یہ کام کسی قدر آسان ہو گیا ہے۔ ابھی تک اس سانحہ کے متعلق فقط سید صاحب کے عقیدت مندوں کے بیانات ملتے تھے جبکہ تریبانی عہد حاضر میں مولانا مہر نے بڑے جوش و جذبہ سے کی ہے (لیکن اب افغان نقطہ نظر کا تھوڑا بہت اظہار بھی سامنے آ گیا ہے۔

(موج کوثر شیخ اکرام ص ۳)

پھر بھی۔ برق گرتی ہے تیہ چائے مسلمانوں پر۔

آخر ”گھر کے“ اُن مصنفین کی گرفت کیوں نہیں کی جاتی۔ جو بے پر کی اڑاتے ہے۔ اور معتقدین بغیر بجالاتے رہے۔ ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ غلطیوں پر متنبہ نہ ہوئے مردان حق کو ”ساحرین افراغ“ کا فیل زدہ قرار دیا جاتا ہے۔ اور انگریزوں کی دعوت آرائیوں کو کچھ نہیں کہا جاتا۔

تمہیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

یہی بات تکفیر و تفسیق کی تو انشاء اللہ تعالیٰ ہم اس کا بھی بھرپور جائزہ لینگے۔ اور دیکھینگے کہ سپاہ زول میں کیا ہو رہا تھا۔ اور بطور جواب آل مغرب یہ بھی ملاحظہ فرمائیں تاکہ ”تودہ دیگ اور کوہ دماوند کا مطلب واضح ہو جائے۔“

لیکن گر بایں ناداں بگوئی خیرے را سپ تازی گو نگویم

آئیے دیکھتے ہیں کہ جناب سید احمد صاحب بریلوی اور مولوی محمد اسماعیل صاحب دہلوی کی تحریک جہاد کا نصب العین کیا تھا۔ آپ دیکھینگے

کہ مقصد جہاد میں بھی یہ حضرات مورخین سخت اضطراب کے شکار ہیں۔

جناب مسعود عالم صاحب ندوی فرماتے ہیں

پچھلے دو تین برسوں میں حضرت سید شہید اور ان کی تحریک تجدید و جہاد کے متعلق جہاں اور غلط بیانیوں کی گئی ہیں وہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ سید صاحب کی جماعت دہلی کی سلطنت

کی کمزوری دور کرنے کیلئے کھڑی ہو رہی تھی۔ حالانکہ سید صاحب اور ان کے مقصد جہاد کی اس سے زیادہ اور کوئی تنقیص نہیں ہو سکتی۔

سید صاحب مکمل اسلامی نظام کے داعی تھے۔ دہلی کی حکومت کو ان کے بلند مقاصد سے کیا نسبت کل نہیں جانتا کہ دہلی کی حکومت خاندانی، شخصی حکومت تھی۔ اور خلافت راشدہ کے نمونے پر حکومت الہی کی تاسیس کرنا سید صاحب کا نصب العین تھا۔

(ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۲۶-۲۷)

یہاں یہ لکھنے میں شاید کوئی مضائقہ نہ ہو کہ اس قسم کی بولکھلا ہیں صرف سید صاحب کے مداحین ہی سے سرزد ہوتی ہیں۔ اور تاریخ کے رخ کو حسب ضرورت موڑتے رہتے ہیں۔ دہلی کی مسلمان حکومت اور اس کی مرکزیت سے یقیناً سید صاحب اور ان کے ہمنواؤں کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ البتہ یہ لوگ انگریزوں کی دعوتیں کھایا کرتے اور گن گایا کرتے تھے۔ اسکے باوجود ندوی صاحب کا پورا طبقہ اس بات پر مصر ہے کہ سید صاحب ہی نہیں بلکہ آپ کے جملہ متعلقین از اول تا آخر تحریک حریت کے سرفروش مجاہد تھے۔

مقصد جہاد کی ایک اور کہانی یہ دعویٰ کہ ”سید صاحب کی دعوت خالص کتاب و سنت کی دعوت تھی“ اور ندوی صاحب کا یہ ارشاد کہ سید صاحب کا مقصد اور نصب العین خلافت راشدہ کے نمونے پر حکومت الہی کی تاسیس کرنا تھا۔ یقیناً قابل رشک ہے۔ اور جس اسے تسلیم کرنے میں بھی کوئی جھجھک محسوس نہیں ہوتی۔ مگر جناب مولانا حسین احمد صاحب مدنی اپنی خود نوشت ”نقش حیات“ میں کچھ اور ہی کہانی سناتے ہیں۔ جس سے ندوی صاحب کے قائم کردہ نظریہ کی نفی ہوتی ہے۔ جناب مدنی تحریر فرماتے ہیں

سید صاحب کا اصل مقصد جو کہ ہندوستان سے انگریزوں کے تسلط و اقتدار کا قلع قمع کرنا تھا جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے اس بنا پر اپنے اپنے ساتھ ہندوؤں کو شرکت کی دعوت دی اور اس میں صاف صاف انھیں بتا دیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک سے پر دہی لوگوں کا اقتدار ختم کر دینا ہے اسکے بعد حکومت کس کی ہوگی اس سے آپ کو غرض نہیں ہے۔ جو لوگ حکومت کے اہل ہونگے ہندو ہوں یا مسلمان یا دونوں حکومت کرنیگے۔

(نقش حیات ص ۱۹ مولانا حسین احمد مدنی)

چنانچہ اسی سلسلے میں سرحد سے ریاست گوالیار کے مدارالعلماء اور مہاراجہ دولت رائے سندھیا کے وزیر اور برادر نسبتی راجہ ہندو راؤ کو جو آپ خط تحریر فرمایا تھا وہ خود سے پڑھنے کے قابل ہے اس سے آپ کے اصلی عزائم اور ملکی حکومت کے متعلق آپ کے نقطہ نظر پر روشنی پڑتی ہے ص ۱۹ اور پھر مولانا حسین احمد صاحب مدنی سید الوالحسن صاحب ندوی کی کتاب ”مسلمانوں کے تنزل سے دینا کو کیا نقصان پہنچا“ کے حوالہ سے وہ خط بھی نقل فرماتے ہیں۔

وقتے کہ میدان ہندوستان از میگا نگال خالی گردیدہ و تیر سخی ایشان بر بدن مراد رسیدہ آئندہ مناصب ریاست و سیاست بطالین آن مستم باد یعنی جو وقت ہندوستان ان غیر ملکی دشمنوں سے خالی ہو جائیگا اور ہماری کوششوں کا تیر مراد کے نشانوں تک پہنچ جائیگا حکومت کے عہدے اور منصب ان لوگوں کو ملیں گے جن کو اپنی طلب ہوگی۔
(نقش حیات ص ۲۲)

کیا یہ ارشادات انھیں کے متعلق نہیں جن کا دہلی کی کمزور حکومت کیلئے اٹھنا انکے عظیم مقصد کی توہین تھی اور یہاں پورا آخر جہاد ہندوؤں کو بخش دینے کیلئے تیار ہیں۔ جناب مدنی اپنی اسی کتاب ”نقش حیات“ میں اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

ہندوؤں سے اختلاف مذہب کی بنا پر آپ کو پرغاش تو کیا ہوئی آپ کمپنی کے ہاتھوں مظلومیت اور پامالی میں ہندو اور مسلمان دونوں کو یکساں جانتے تھے اور جہاد سے آپ کی غرض دونوں کو ہی اجنبی اقتدار کی مصیبت سے نجات دلانا تھا۔ کامیاب ہونے کے بعد ملکی حکومت کا نقشہ کیا ہوگا اسکا فیصلہ آپ طالبین مناصب ریاست و سیاست پر چھوڑتے ہیں۔

مگر ہندوؤں کو اطمینان ضرور دلاتے ہیں کہ وہ سید صاحب کی کوششوں کو اپنی ریاست کی بنیاد کے مستحکم پہنیکا باعث سمجھیں۔۔۔۔۔ بدیشک سید صاحب جگہ جگہ اعلیٰ کلمہ اللہ اور دین رب العالمین کی خدمت کا ذکر کرتے اور اسی کو اپنی مساعی کا محرک بتاتے ہیں۔ لیکن آپ خوب سمجھتے ہیں کہ اعلیٰ کلمہ اللہ کا ذریعہ صرف یہی نہیں ہے کہ۔ ایک فرقہ وار گورنمنٹ قائم کی جائے اور خود حاکم بنکر دوسرے برادران وطن کو اپنا محکوم بنایا جائے۔ بلکہ اس کا سب سے زیادہ موثر طریقہ یہ ہے کہ برادران وطن کو سیاسی اقتدار میں

اپنا شریک کر کے اسلامی فضائل اخلاق سے انکے دلوں کو فتح کیا جائے۔

اقلیت و اکثریت کے مسئلہ کی کوئی پیچیدگی آپ کے ذہن میں نہیں تھی کیونکہ آپ کے نزدیک دونوں بے حقیقت چیزیں تھیں۔ جو اپنے عمل میں سب سے زیادہ پرورش، خدا کار، سرگرم اور مخلص و دیانتدار ہوگا امامت اور لیڈرشپ اسکے ہاتھ میں ہوگی خواہ وہ اقلیت کے فرقہ سے تعلق رکھے یا اکثریت کے فرقہ سے

(نقش حیات ص ۲۲)

یہ ہے جہاد فی سبیل اللہ خالیتہ لوجہ اللہ کی المنک غرض و غایت۔ جو بقول ندوی صاحب ”کتاب سنت“ کے عین معنی تھی راغور کیا جائے اور جناب حسین احمد صاحب مدنی کی تشریحات کو مد نظر رکھا جائے تو اس جہاد کا راستہ کتاب سنت سے ہوتے ہوئے بھارت کے موجودہ نظام سیکورٹیت تک جا پہنچتا ہے۔ تعجب ہے کہ سید صاحب کے مداحین پھر بھی اسے خالص جہاد فرماتے ہیں۔

ندوی صاحب فرمائیں کہ ہم لوگ کیا کریں۔ آپ کی توضیحات قبول کریں، یا دیوبند کے شیخ الحدیث کی تشریحات کو مانیں مذکورہ مندرجات سے کئی انتہائیاں سامنے آرہی ہیں مثلاً یہی کہ دہلی کی حکومت کو مضبوط نہیں کیا جاسکتا! کیونکہ وہ خاندانی اور شخصی تھی۔ مگر ہندو راجاؤں کو یہ یقین دلایا جا رہا ہے کہ اپنی ریاست کی بنیاد کو مضبوط و مستحکم سمجھیں۔ اور یہ بھی غور کرینیکی بات ہے کہ ”حکومت علی منہاج النبوة“ کی بات اسوقت کہاں جا پہنچتی ہے جب کہ اس خالص جہاد سے حاصل کردہ حکومت الہی کو مولانا مدنی ”فرقہ دار گورنمنٹ“ قرار دیتے ہیں اور مورخین حضرات خلافت راشدہ کا نمونہ بنانے پر اصرار فرماتے ہیں۔ کیا اس طبقہ کو کوئی ایسا فرقہ ہے جو اس ”فرقہ دار گورنمنٹ“ کی وضاحت کر سکے!۔ سچ یہ ہے کہ برادران وطن، دوسرے لفظوں میں ہندوؤں کی ہوا خواہی اور چاہت نے مولانا مدنی سے ایسی ایسی باتیں کہوائی ہیں جنہیں پڑھ کر ایک مخلص مسلمان لرز اٹھتا ہے۔

اب مولانا مدنی سے کون پوچھے کہ حضرت خیر القرون (دور رسالت میں) اور پھر دور خلافت میں۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ اور انکے اطراف و جوار میں مشرکین و یہود اور نصاریٰ آباد تھے یا نہیں اور یہ کہ آپ کی اصطلاح میں وہ ”برادران وطن“ تھے یا نہیں۔ اگر تھے تو انھیں کیوں اسلامی حکومت میں شامل نہیں کیا گیا۔ کیا آپ اس حکومت کو ”فرقہ دار گورنمنٹ“ کہہ سکتے ہیں!

ہیں قرن اول میں کہیں یہ بات نہیں ملتی کہ حکومت برادران وطن کے سپرد کر کے اخلاق فاضلہ کی مادی جاری ہو جو کہ زید و بند حسین احمد ایچ جی بوالعجبی است

کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ علمائے کرام کے اس نیشنلسٹ طبقے نے اپنے اسلامی اخلاق فاضلہ سے کتنے "برادران وطن" کو دوزخ سے نجات دلائی ہے؟ اسکے خلاف اگر تاریخ کا لکھرا مطالعہ کیا جائے تو بات بالکل برعکس نظر آتی ہے مثلاً یہ کہ فرارات کے بجائے، سماوی پھول پڑھانا، میلاد کے بجائے رام لیلا کی تیاری کرنا۔ یا رسول اللہ کے بجائے، گاندھی جی کی جے بکارنا۔ دوردوسلام کے بجائے۔ بندے ماترم کے ترانے گانا۔ ردادارل میں ذبح گاو کو ممنوع قرار دینا وغیرہ وغیرہ۔ پھر بھی کہتے ہو پھول جاؤ مجھے بخدا میرے بس کی بات نہیں۔

بات شخصی حکومت کی ارہی بات شخصی حکومت کی تو یقیناً اس حکومت کو خلافت علیٰ منہاج النبوة نہیں کہہ سکتے۔ مگر عرف عام میں اسے اسلامی حکومت ٹوکہ سکتے ہیں۔ اگر یہ بھی نہیں تو مسلمانوں کی حکومت ہی کہہ لیجئے ورنہ تیرہ صدیوں کا طویل راستہ تاریکیوں میں گم ہو جائے گا۔ دور بنو امیہ، دور بنو العباس، دور عثمانی و ترکی، جسکے لئے تحریک خلافت چلائی گئی۔ اور پھر فاطمیوں، علویوں، سلجوقیوں، غوریوں، غزنویوں، مغلوں، افغانوں کے متعلق بھی دریافت کیا جائیگا کہ انکے متعلق کیا فرماتے ہیں علمائے دین!

اور پھر ان سب کے بعد ہم یہ بھی پوچھیں گے کہ حکومت سعودیہ عرب کے متعلق آپ کے کیا خیالات ہوں گے جسکے احیائے قرآن و سنت کا نفاذ پورا قافلہ بڑے تندہ سے بجا رہا ہے۔ اس کی کچھ تفصیل جناب شورش سے سنئے وہ کیا فرماتے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے بھی ساری عمر اسی مکتبہ فکر کی نمائندگی ہمنوائی فرمائی ہے۔ اور موصوف کبھی علمائے دیوبند کی صف اول کے جانبازوں میں تھے۔ اور آخری عمر میں جناب مودودی صاحب اور ان کی جماعت سے بڑا گہرا تعلق قائم ہو گیا تھا۔ جناب شورش کی اس جرأت پر علمائے دیوبند اتنے برہم ہوئے اور انکے خلاف ایسی دل آزار زبانیں استعمال کیں کہ وہ ان علمائے کرام کے ساتھ جنت میں بھی جانے کیلئے تیار نہ تھے۔

اور جب پانی سر سے گزر گیا اور الزامات و بہتان کی یلغار حد سے گذر گئی تو باہر مجبوری انہوں نے بھی دہوا قلم کی باگ ڈھیلی کر دی۔ جناب شورش گھر کے بھیدی تھے ان مقدسین کو گھر بیچ کر دم بیا

انہوں نے ہر سازش کو بے نقاب کیا۔ نہ حکمران نجد کی شمشیر برائ، نہ علمائے دیوبند کے دھار دار قضاے اور نہ ہی ندوی صاحب جیسے لوگوں کی ہلاکت خیز تحریریں انکے سردار ہوئیں۔ فرماتے ہیں

سعودی حکومت قرن اول کی حکومت نہیں! آجکی بادشاہت سے۔ بادشاہت منشاے نبی نہیں۔ قیصر و کسریٰ کی یاد گار ہے اور ہم نے اپنے لئے اسے مشرف باسلام کر لیا ہے۔

شب جائیکہ من بودم شورش کا شمشیری

جناب شورش علمائے دیوبند سے متعلق ہونیکے باوجود قبروں کا انہدام اور آثار مقدسہ کی پامالی دیکھ کر رزائے تھے ہیں اور فرماتے ہیں۔

جو لوگ اسکا نام قرآن و سنت کے احکام لکھتے وہ خود کس منہ سے تاج شہی پہنتے۔ اونچے اونچے محل بناتے محمد عربی کی دولت سمیٹتے اور اسکا نام خزانہ شاہی لکھتے ہیں جن ذات اقدس کے صدقہ میں عزتیں پائی ہیں انکے آثار اقدس کی یہ بیحرمتی! یہ قرآن و سنت نہیں امانت اور صریح امانت ہے۔ اللہ کی زمین اور انکے دینے اُس کی مخلوق کے مال میں کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ انسان کا گلہ بنا لے، خود چرواہا بن بیٹھے، گوشت کھائے کھا لیں بیچ ڈالے۔ موت کسی کا بیچا نہیں چھوڑتی۔ جو موت کی اس طرح تک کر رہے ہیں..... لیکن جنت معلیٰ میں وہ لوگ سو رہے ہیں جو ہمیں زندہ کر گئے، ہمیں بقادے گئے۔ جو نہ پھیر کر شاہوں پر نگاہ کرتے تو انکی گود لیلیں سے خلعت فاضلہ کا نپ اٹھتے تھے۔ سعودی حکومت عشق اور شرک میں فرق نہیں کر سکی ہے۔

شب جائیکہ من بودم ملا

قبروں کا استیصال سید صاحب کے جہاد کے منجملہ مقاصد میں قبر پرستی کا استیصال بھی تھا چنانچہ جناب مسعود عالم صاحب ندوی اپنی کتاب "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" میں "دعوت اور مشن" کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں۔

سید صاحب کی دعوت خالص کتاب وسنت کی دعوت تھی بدعت و شرک کا نشانہ ان کا مشن تھا۔ وہ دین محمدی میں عہد فاروقی کی پاکیزگی اور شوکت پیدا کرنا چاہتے تھے توحید خالص کی تبلیغ قبر پرستی کا استیصال مراسم تفریح کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا اور نکاح بیوگان کی ترویج ان کی دعوت کے اہم اجزاء تھے۔

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ۱۳۵۰

مسلمانوں پر قبر پرستی کا الزام نہایت سنگین الزام ہے۔ دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی مسلمان آباد ہیں کہیں بھی قبر پرستی نہیں ہوتی مزار اور صاحب مزار کے احترام اور فرائض خوانی کو پرستش اور پوجا تعبیر کرنا بہت بڑا المیہ ہے۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام نامی استعمال کر کے مزارات کو منہدم اور پامال کرنا انتہائی بربریت ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تمام دہلیویہ نے جذبہ توحید کے فروغ کیلئے قبروں کے انہدام اور استیصال کو جزو ایمان بنا رکھا ہے۔ اور ہم بالیقین کہہ سکتے ہیں کہ مکہ و مدینہ کی قبروں کے انہدام میں یہی جذبہ کارفرما تھا۔ چنانچہ دہلیویان نجد نے حجاز مقدس پر غلبہ و استقلال کے بعد جشن فتح قبروں کی پامالی ہی سے شروع کیا تھا۔

یہاں یہ بحث نہیں کہ اسکی شرعی حیثیت کیا ہے (اس باب میں علمائے کرام نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ مزید کی ضرورت باقی نہیں رہتی) میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اپنے بزرگوں اور اپنے آباؤ اجداد کی قبروں کے بارے میں ان موحدین مقدسین کا طرز عمل کیا رہا ہے۔ یہی جناب مسعود عالم صاحب ندوی اپنی اسی کتاب ”ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک“ میں بڑی تفصیل سے ایک مجاہد کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”جب بیس سال کے بعد انڈیا سے واپس ہوئے (سنہ ۱۳۱۰ھ) تو خاندانی قبرستان کا یہ دلدوز منظر دیکھ کر دل بھر آیا اور کرنا کا تین کی انتہائی سختی کے باوجود آنکھوں سے خون کے قطرے ٹپک پڑے۔ میں نے چاہا کہ اپنے خاندانی مقبرہ کو جہاں چودہ پشتیں سے مہا آباؤ اجداد دفن ہوتے چلے آئے تھے جا کر دیکھوں اور خصوصاً اپنے والدین ماجدین غفر اللہ لہما کے مزار کی زیارت کروں اور اس پر دعائے مغفرت اور فاتحہ پڑھوں۔ مگر ہر چند کوشش کی پتہ نہ ملا بعد تحس و تخلص بسیار غور فکر کے قریب سے معلوم

ہوا کہ حضرت والدین ماجدین کی قبر کھود کر اس پر بنائے عمارت میونسپلٹی بنا دی گئی ہے۔ (ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۱۳)

اور پھر صفحہ ۲۱ پر مزید تحریر فرماتے ہیں۔

اے حضرات ناظرین! اس وقت اس حرکت کا جو ہمارے اموات کیساتھ کی گئی جو صدر دل پر گذرا وہ بیروں از حیضہ تحریر و تقریر ہے اس وقت اس کی یاد سے رونگٹے تک کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے جرم میں ہمارے اموات و آباؤ اجداد کی قبریں کیوں کھودی گئیں اور وہ مقبرہ کیوں معرض ضبط میں آیا ”عادل گورنمنٹ“ نے کیوں یہ کام کیا۔

(ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۱۳)

اس کیوں کا جواب ”عادل گورنمنٹ“ ہی دے سکتی ہے کہ اس نے کیوں ایسا کیا۔ البتہ بلا جرم مگر مدینہ کے مقابر پامالی ہو سکتے ہیں تو یہاں کوئی چیز مانع ہے۔ سنئے حضرات! اختلافات نظریات کے باوجود ہم قبروں کی اس پامالی کی تائید نہیں کر سکتے۔ انگریزوں نے دہلیویان صا دقپور کی قبروں کو مسامحہ کر کے انتہائی سنگینی کا مظاہرہ کیا ہے۔

مگر مکافات عمل بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ یہ دہی لوگ ہیں جنکی آنکھیں مقبرہ سیدہ خدیجۃ الکبریٰ سیدنا امیر حمزہ شہدائے بدر و احد، روضۃ فاطمۃ الزہری، آرام گاہ شہدائے کربلا کی پامالی اور انکی ہجرت پر غناک نہیں ہوئی تھیں۔ اب ان کی آنکھوں سے کرنا کا تین کی انتہا زور آوری کے باوجود خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

بہر صورت تاریخ اپنے اوراق الٹی ہے۔ اور تنک الایام نداؤ لہا کی تفسیر ہر دور میں لکھی جاتی ہے۔ عرب اور حجاز مقدس میں انگریزوں کی مدد سے نجدیوں نے جو کچھ کیا۔ قدرت نے انگریزوں ہی کے ہاتھوں ہندوستان میں انکے مویدین کیساتھ وہی صورت پیدا کر دی۔ دیکھئے ندوی صاحب کیا فرماتے ہیں۔

نجد کی دعوت کے علمبردار شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب کی نسبت کرنا جو تو محمدی کہنا چاہئے۔ البتہ عزم و عمل کی مرہ قوتوں کو سبلا رکھا۔ بیجان پیکروں میں نہ کی حرارت

ڈال دی اور پورے خطے کو اسلامی رنگ میں شراور کر دیا۔ یہ ایسا گناہ ہے جسے شاطران فرنگ اور ان کے ہونخواہ معاف نہیں کر سکتے۔

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک^{۱۳}

جہاں شریعت کی فراروائی ہے | کاش ایسا ہی ہوتا جیسا کہ ندوی صاحب نے فرمایا اور جی خمدوشنا میں ندوی صاحب جیسے سیکڑوں

لوگ "دعوت کھا کر خلعت لیکر" شب و روز طب اللسان نظر آتے ہیں۔

اس باب میں جناب شورش کے علاوہ ہم میں سے کوئی کچھ کہہ دیتا تو کھرام بچ جاتا۔ ہزاروں نذرے لہرائٹھے اور نہ جانے کتنی آنکھیں خون اگلنے لگتیں۔

یاد رہے کہ جناب شورش نے جو کچھ لکھا ہے وہ ایک ایسی دستاویز اور ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ لکھتے ہیں۔

غار ثور۔ اداس پڑا ہے اس کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے لیکن بادشاہت نے قرآن و سنت کی آڑ میں اس پرویرانی کی دیوار کھینچ دی ہے۔

(شب جانیکن بدوم ص ۲۸)

اور صفحہ ۲۸ پر لکھتے ہیں۔

ان کے بل سب سے زیادہ خطرناک چیز کتابیں ہیں، اخبار اور رسالے ہیں، اصل وقت زبان کی ہے کلام اللہ کا اردو ترجمہ جیسا کہ یہاں روک لیا جاتا ہے۔

لیکن لبنان کے عربی جرائد و رسائل بالخصوص جن میں حوالی بیانیوں اور زینا کی ہم نشینوں کا خورہ نمایاں ہوتا ہے ہر قدغن سے آزاد ہیں۔ وہ روزانہ آتے اور روزانہ لکھے ہیں اور ان کی خریداری عورتوں میں بکثرت ہوتی ہے۔ ان پر بہت اور نیم برہنہ رسالوں پر کوئی پابندی نہیں۔ پابندی اس لٹریچر پر ہے۔ جس کے متعلق یقین کیا شبہ ہو کہ اس میں مزاج شاہی پر چوٹ پڑتی ہے۔

(کتاب مذکور ص ۲۸)

مولد النبی رفاہ ابی دمی، کی زیارت کے بعد لکھتے ہیں۔

میں مولد النبی اور سیرت النبی (صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم) کے پاس کھڑا یہ سوچتا رہا کہ انسان کیا ہے؟ حضور کی مکی زندگی یاد آگئی ان مکہ والوں نے حضور سے کیا سلوک کیا تھا کہ ان کے مکانوں سے کوئی سلوک کرتے۔

غار حرا کی زیارت کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

اس قسم کی دوچار چیزیں محفوظ کرنی جائیں تو عیب کیا ہے؟ اس سے قرآن و سنت کی خلاف ورزی کہاں ہوتی ہے اور کہاں منشاء الہی کی نفی ہوتی ہے

آخر حکومت خود کو بھی تو محفوظ کر رہی ہے۔ اگر شریعت کا اتنا ہی خیال ہے تو شریعت یہ نہیں ہے کہ جیل نو تیم پڑا ہے اور اسکی نگہداری سے قطع نظر کیا جائے۔

شریعت کے احکام معاشرہ اور ریاست کیلئے ہیں آثار و مظاہر کیلئے نہیں۔۔۔۔۔ جہاں اجتہاد لازم ہے وہاں اجتہاد کا نام بدعت بلکہ بغاوت رکھ دیا ہے۔

خلفائے راشدین کیا اپنے ساتھ حفاظتی دستے رکھا کرتے تھے۔ وہ طیاروں میں اڑتے پھرتے تھے۔ کیا انہوں نے گرام اور سرا کے دارالحکومت بنائے تھے۔ کیا ان کے محل اور قصر تھے۔ کیا ان کے لئے سیاحے تھے۔ وہ شاہانہ کو در سے حرم میں داخل ہوتے تھے۔ انھیں جلالتہ الملک کہا جاتا تھا۔ وہ فلک و بن عمارتیں کھڑی کرتے

تھے وہ سونے کے زیور اور ریشم کے کپڑوں میں تلے تھے۔ وہ میلیوین لگاتے تھے۔۔۔ جب نئے دور کی سب چیزیں قبیل کوئی ہیں تو ایک تاریخ اور اسکے خزینے ہی ایسے ہیں جنہیں محفوظ رکھنا بدعت ہے۔

یا خلافت سنت۔۔۔۔۔ یہ سب اللہ کے نبی کی آخری نشانیاں ہیں۔ تاریخ کے جواہر برترے اور عقیدے کے شہ پائے ہیں انھیں سے تاریخ کو تحقیق اور رائیوں کو وحش کی راہیں ملتی ہیں۔۔۔۔۔ غار سیرت النبی کا پہلا پڑاؤ ہے۔ ایک وہاں حضور کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہیں۔ اور ان کے ہونٹوں کا ارتعاش جہاں گھٹا ملا معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔۔ سلام ہوائے جبل نور سلام ہوائے غار حرا

شب جانیکن بدوم ص ۲۶

بدل کی زیادت کے بعد تحریر فرماتے ہیں!

ان کی قبریں آج دارخانِ سنت کے اہتول پامالی ہو چکی ہیں تاریخ کے وہ عظیم الشان آثار
محو ہوتے جا رہے ہیں۔ جنہیں عقیدہ اور ابھیل نہ مٹا سکے انہیں ہم اپنے ہاتھوں سے محو کر رہے ہیں
..... یہ قرآن و سنت نہیں یہ سنگینی و سنگدلی ہے۔ کہ رسول اللہ کی یادگاریں مٹائی
جائیں اور اپنی یادگاریں کھڑی کی جائیں۔

شبِ جاوید من بودم ۱۱۵

احمد کی زیادت کے بعد لکھتے ہیں۔

اس احمد کے دامن میں زمین سے دوڑتے بلند اور پہاڑ سے ڈھیروں نیچے پھرتے حمزہ
عبداللہ ابنِ جحش اور مصعب ابنِ عمیر کی قبریں ہیں لیکن آلِ سعود کی شرعی یلپانے
ہموار کر دی ہیں..... ہندو نے حمزہ کا کلیجہ جیایا تھا لیکن انہوں نے حمزہ کی قبر جیادالی
کتاب مذکور ص ۱۵

اور پھر لکھتے ہیں۔

ان مزارات کی بھرتی کا نام ان کے نزدیک قرآن و سنت ہے کیا انہیں روحوں کے اس
سفینی عظمت کا اندازہ نہیں... مگر اسی روکنے کی آڑ میں بھرتی جا رہے؟ کیا عشق کا نام
عروں کی لغت میں شرک ہے... میں عربی سے واقف ہوتا تو کوہِ صفا اور جبلِ احد پر کھڑے
ہو کر پکا کاتائے محمد کے ہم وطنوں نے جنتِ البقیع میں ہل چھو کر کہا ہے دل کے شیشے
توڑے ہیں اور اب ان میں کوئی صدا باقی نہیں رہی ہے۔
شبِ جاوید من بودم ۱۱۶

ذکرِ جب چھڑ گیا قیامت کا
قارئین! نہ چاہئے کہ یا وجود بھی بات بڑھتی چلی گی
اور مقدمہ طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا۔

• یہ ہے کہ کچھ بڑے لوگوں سے چند غلطیاں ہو گئی تھیں۔ جن پر دردمند لوگوں نے انتباہ کیا
تھا۔ اور ان غلطیوں کی نشاندہی کی تھی۔ مگر اصلاح قبول کرنے کے بجائے ہند اور بدھ دھرمی
کا طریقہ اختیار کیا گیا اور ایک نہ ختم ہونی والی سرد جنگ شروع ہو گئی۔ اور حالات یہاں تک پہنچے

کہ جو لوگ شریعت و طریقت میں ایک تھے جماعتوں اور فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔

• اور کچھ لوگوں نے یہ کیا کہ اپنی بات لکھنے کیلئے تاریخ کے پھرے کو مسخ کر ڈالنا کہ اپنے ممدوحین
کو فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھاسکیں۔ اور دوسروں کو عظمت کی بلندیوں سے مذلت کی گہرائیوں
میں دھکیل دیں۔

مگر جس طرح بلند بالا پہاڑوں کے دامن میں وسیع زمین کی پرسکون تہوں میں اور ناپید انکار
سمندر میں گہرائیوں میں بے شمار خزانے اور بے پناہ عجائبات دفن ہیں۔ اسی طرح تاریخ کی
پہنائیاں بھی گوناگوں حالات و واقعات سے لبریز ہیں اور اصل شکل و صورت بہر حال ظاہر ہو کر رہتی ہے
• زیرِ نظر کتاب "پاک و ہند کی چند اسلامی تحریکیں اور علمائے حق" اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک
تاریخی، سیاسی، مذہبی، جغرافیہ ہے اس میں مختلف موضوعات پر بحث کی گئی ہے اور جہاں تک میں
سمجھتا ہوں اس دور میں اس کی سخت ضرورت ہے۔

اس بات سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکا کہ صحیح صورت حال کا اظہار ہی لوگوں کو غلط فہمیوں
سے بچا سکتا ہے۔ آج حقیقت حال کی واقفیت ہی کی وجہ سے ایک بہت بڑا طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ
جناب سید احمد صاحب بریلوی اور مولوی محمد اسماعیل صاحب دہلوی کی تحریک جہاد نے انگریزوں کو
رزہ برانداز کر دیا تھا۔

اور یہ کہ پٹھان ظالم اور منافق تھے۔ مجاہدینِ مظلومیت کی حالت میں شہید کر دئے گئے۔ مگر
نفسِ واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ افسوس کہ ماضی میں پٹھانوں کے نقطہ نظر جاننے کی کوشش
نہیں کی اور یکطرفہ فیصلہ ہوتا رہا۔

• صحیح یہ ہے کہ سید صاحب اور مولوی محمد اسماعیل صاحب نے انگریزوں سے ایک لڑائی بھی نہیں
لڑائی کے مابین خاصا بھائی چارہ رہا ہے۔ البتہ پٹھانوں پر انہوں نے عرصہ حیاتِ حضورِ تنگ کر دیا تھا۔
صوت یہ کہ انہیں سید علیخ لونا اور قتل کیا گیا۔ بلکہ انکی عصمتوں کو بھی پامال کر دیا گیا تھا۔ نتیجہ پٹھانوں ہی
کے ہاتھوں ہند کی دہائی تحریک اپنے خوفناک عزائم کیساتھ انجام کو پہنچ گئی۔

• اسی طرح جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں انکی کوئی خاص خدمات نہیں۔ یہ لوگ انگریزوں کے خون
چھپتے پھرتے تھے۔ بلکہ حریت پسندوں نے جنگ کرتے تھے مگر جہادِ مملکتوں نے انہیں

مجاہدین کی صف اول میں کھڑا کر دیا ہے اور اب تحریک آزادی کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔

● تحریک خلافت کے دوران، تحریک ترک موالات چلائی گئی اور پھر ہندوؤں کے اٹاے پر تحریک ہجرت کے بانی مہاتما بنے ان موجدین نے سرکین سے نانا جوڑا، فرنگی اور برہمنی سازش کے شکار ہوئے۔ جسکا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جوش و جذبہ سے اٹھائی ہوئی یہ تمام تحریکیں ناکام ہو گئیں۔ پھر بھی اسلام انوت کو توڑ نواہوں اور برادران وطن سے غیر فطری رشتہ جوڑ نواہوں کی آنکھیں سرخ ہیں۔

● ہندو اکثریت کے دباؤ، اوگاندھی جی کے اٹاے پر برادران وطن کو خوش کرنے کیلئے دھوکے کو ممنوع قرار دیا۔ اور ان سے ملکر ایک قومی نظریہ کی بنیاد رکھی۔ مسلمانوں کے ملی تشخص کو پامالی کیا۔ ایمان والوں کو اٹھاہ تاریخوں کے حوالے کر دیا۔

● مسلمانوں کے ملی اور قومی امتیاز و تشخص کا سوال پیدا ہوا اور قیام پاکستان کی تحریک چلی تو حضرات اخوت اسلامی سے اغراف کر کے ہندوؤں سے مل گئے۔ قیام پاکستان اور مسلمان رہنماؤں شدید ترین مخالفت کی مگر پاکستان بننے ہی "تحریک پاکستان کے" ہیرو نظر آنے لگے۔

چوہدری حبیب احمد اور نیشنلسٹ علماء
مورخ ہونا تو بڑی بات ہے مجھے تو اپنے آپ کو تاریخ کا طالب کہنے بھی شرم محسوس ہوا ہے۔ مگر یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ہر انسان فطرۃً تاریخ سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اسے طبعاً ماضی و حال بلکہ مستقبل سے بھی دلچسپی ہوتی ہے۔ اپنے گرد و پیش رونما ہونے والے احوال و واقعات سے باہر ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

اور یہ کون نہیں جانتا کہ تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے جسکے سامنے آنے کے بعد کوئی شخص اپنے چہرے کے حسن و قبح کو نہیں چھپا سکتا اس سلسلے میں بچائے اسکے کہ میں خود کچھ عرض کروں جناب چوہدری حبیب احمد صاحب کی کتاب "تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" سے اقتباس پیش دینا ہی زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔

تاریخ کیا ہے؟ یہ عجیب دو دھاری تلوار ہے یہ موافقت و مخالفت اور حمایت و محاصرت کے کردار کے تمام ہیروؤں کو نکھار اور ابھار کر سامنے لاتی ہے۔ اگر کسی قوم کے پاس اسکی صحیح تاریخ موجود ہو تو وہ قوم اپنے ماضی کے تجربات کے آئینے میں اپنے حال کو دیکھ کر خستہ

اور مستقبل کو تابندہ بنا سکتی ہے۔ لیکن اگر تاریخ غلط ہے تو وہ غلط فہمیوں کی ایسی نندہ بنا تاریکیوں میں گھری رہتی ہے جس سے اس کا نکلنا محال ہو جاتا ہے۔
آج شاید کوئی یہ بھی باور نہ کر سکیو تیار نہ ہو کہ پچیسل تیس برس قبل ہمارے چوٹی کے مذہبی پیشوا اس قسم کے کھیل بھی کھیلتے رہے ہیں اور یہ سب کچھ وارد ہوا آشرم کے مہاتماؤں اور آئندہ جموں کے پندتوں کی نیشنلسٹ فوج کا ہر اول دستہ بن کر سر انجام دیا گیا۔
و حقائق کی یہ دلاور جگر سوز تفصیل کتنی ہی غیر پسندیدہ کیوں نہ ہو بہر حال ہماری تاریخ آزادی و استقلال کا عبرت انگیز باب ہے۔

ان مقدسین نے غیروں کے اٹاے پر "مذہب قیامت" کے نام پر ایک نیا سوسنات تعمیر کیا اور تحریک پاکستان کے خلاف اس بت کی پرستش عین اسلام قرار دی۔
شہادت دے رہی ہے کہ علامہ اقبال اور مولانا حسین احمد مدنی کے مابین یہی محرکین و وطن رونما ہوا۔ خود ہمارے گھر کے جتہ دستار میں پٹے ہوئے، مذہبی پیشوا امام الہند اور شیخ الہند اسکے مقابل میں مقدمۃ الجیش بنا کر کھڑے کئے تھے۔
ہماری نئی نسل یہ تصور بھی کر سکتی ہے کہ مسلمانوں کیلئے جس جہاد گاہ مملکت کے حصول و قیام کی جنگ بڑی جبار ہی تھی اسکی سب سے زیادہ مخالفت خود مسلمان اور اسکے مذہبی اجارہ داروں کی طرف سے ہوئی! لیکن اس تلخ اور الماناک حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ایسا ہوا اور روز روشن میں ہوا!

الہٰذا ضروری ہے کہ ان قوتوں کے حدود و احوال بھی نمایاں اور واضح کر دیں جو پرفریب اداؤں، عشوہ طرازیوں اور اسلام کے مقدس ذرین نقاب اوڑھ کر ملت کی نشاۃ ثانیہ کی مخالفت میں پیش پیش رہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ اُنکے نام و کام کے تذکرہ سے ماضی گزیدہ اور شخصیتیں ناراض و برہم ہونگی۔ انھیں جان لینا چاہئے کہ تاریخ نے آج تک کسی کو معاف کیا ہے نہ فراموش! (یاد رہے کہ) ہماری ذخیرہ نویس اور آئینہ الامانہ اس بات کا شدت سے منتظر ہے کہ ان حقائق و واقعات کو ابھار اور نکھار کر سامنے لایا جائے جن سے تحریک

پاکستان کو دوچار ہونا پڑا۔ اور اسلام کے ان منافقوں، اور غداروں کو بے نقاب کر کے انکے سامنے کھڑا کیا جائے۔ جو گاندھوی فلسفہ کے مؤید اور حمایتی بن کر قیام پاکستان کی تحریک کی مخالفت میں پیش پیش ہوئے۔

دو مقدمہ تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء، چوہدری حبیب احمد

الحاصل۔ اس کتاب میں علمائے حق (علمائے اہلسنت) پر ناروا وار کئے گئے چند اعتراضات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اسکے ساتھ ہی ان بے انصافیوں کا بھی ذکر ہے جو جانبدار تذکرہ نگاروں نے علمائے حق پر روا رکھی ہیں۔

اہل قلم کی بے انصافیاں

جہاد حریت ۱۸۵۷ء اور اسکے قادیان و مجاہدین کے بارے میں ہمارا نقطہ نظریہ ہے کہ یہ لوگ آئے دینے اور تدارک دہ تھے کہ تاریخ میں انکے نام سہرے حروف میں کھے جانے چاہئے تھے مگر اس دور کے ہنرمند تذکرہ نگار حضرات نے انکے ذکر میں نہ صرف یہ کہ سخت بے احتیاطی کی ہیں بلکہ انتہائی بددیانتی کے مرتکب بھی ہوئے ہیں۔ اس باب میں یہ بات بلا توجہ نزدیک کی جاسکتی ہے کہ وہ تذکرہ نگار حضرات جنہیں وفادار مکر کا ہونے کی حیثیت سے استبداد کی ان ہوا گئی تاریخوں میں تحریر و تقریر کی تمام سہولتیں حاصل تھیں مجاہدین ۱۸۵۷ء کی نہایت ظالمانہ انداز میں کردار کشی کی ہے۔ بلکہ تاریخ کیساتھ ایک ایسا گھناؤنا اور دل آزار مذاق کیا ہے کہ اب اسکا ازالہ ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

ان حضرات نے اولاً تو جہاد حریت کے جانبازوں کا ذکر ہی نہیں کیا ہے اور اگر کہیں مجبوراً ان کا نام آج بھی گیا تو اس قدر استحقاقات اور حقارت سے کام لیا گیا ہے کہ اسکے پڑھنے سے دل لرز اٹھتے ہیں اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ اگر بنظر تحقیق دیکھا جائے تو قلم ایسے لوگوں کے ہاتھ میں نظر آتے ہیں جنہیں پروردہ سرکار کہا جائے تو کچھ غلط بات نہ ہوگی۔ جو اپنی تمام تر ظاہری ثناءات کے باوجود عناد اور جانبداری کی کثافت سے آلودہ نظر آتے ہیں

جانبداری کی ان حوصلہ شکن تاریخوں کے باوجود پوسے یقین کیساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ دل دور نہیں جب صداقت کی روشنی پھیلے گی اور عناد و جفا کے تہ در تہ گھیر بادل وفا و صداقت کی دل آویز کرنل کو تادیر نہیں روک سکیں گے۔ اور عظمت کی خود ساختہ بلندیاں زیر و زبر ہو جائیں گی۔

دو فراموش قوم کا فرزند عظیم

اس دردناک نظر اندازی کا شکوہ صرف ہمیں ہی نہیں بلکہ ہر اس اہل علم اور اہل قلم کو ہے جس میں ذرا بھی انصاف و انسانیت کی خولیا باقی ہے۔ چنانچہ جناب رئیس احمد جعفری اپنی معرکہ الارا تصنیف ”سہادر شاہ ظفر اور انکا عہد“ میں تحریر فرماتے ہیں۔

مولانا (فضل حق علیہ الرحمہ) کی شخصیت، اسیرت اکو دار، اور علم و فضل پر ضرورت تھی کہ ایک معقل کتاب لکھی جاتی لیکن وہ ایک دُور فراموش قوم کے فرد تھے۔ فراموش کر دئے گئے اور کچھ دلوں کے بعد لوگ حیرت سے دریافت کر سینگے۔ یہ کون بزرگ تھے۔ (سہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد ۱۸۵۷ء رئیس احمد جعفری)

حقیقت یہ ہے کہ ان عظیم المرتبت لوگوں کی کردار کشی ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت کی گئی ہے اور مجاہدین جنگ آزادی کے ہر دماہ کی طرح چمکتے دھمکتے پہروں پر جس طرح لوگوں نے اپنے دلی سپاہیاں ملی ہیں اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اور اب ایک طویل عرصہ گزر جانیکے بعد اس کا کفارہ ادا کرنا ناممکن نظر آتا ہے۔

معاندانہ طرز عمل اس سلسلے میں جناب جعفری فرماتے ہیں۔

لیکن اس سلسلے میں جو چیز قطعیت کیساتھ نظر اندازی کی گئی ہے وہ ہے مجاہدین کا ذکر۔ ذکا اللہ نے اپنے تاریخ میں انہیں ”مجاہدین“ قرار دیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے، سرسید نے اور دوسرے بزرگانِ ملت نے جو لکھا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات یا تو ان مجاہدین کے وجود سے ناواقف تھے یا اگر واقف تھے تو نہ صرف یہ کہ انہیں اہمیت نہیں دیتے تھے بلکہ انکے جذبہ اور کردار اور عمل کا استحقاق کرتے بہتے تھے۔ انکے انداز میں اتنی بددی خیریت اور پر عناد اجنبیت ہے کہ اسے دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ لیکن خود ان لوگوں نے اور انکے آقا یاں ولی نعمت یعنی انگریزوں نے دستاویزی ثبوت کو سامنے رکھ کر جھاللات لکھے ہیں جو واقعات قلمبند کرنے میں جن کیفیت کا جائزہ لیا اور تجزیہ کیا ہے انہیں پیش نظر رکھئے تو انکے مخالفانہ اور معاندانہ غیر مہذب اور ناشائستہ الفاظ و لب و لہجہ کے باوجود بین السطور اس مجاہدین کا روشن بلند اور بزرگ

رنگ کردار صاف جھلکتا نظر آتا ہے جیسے میروں و ادات میں بجلی چمک جاتی ہے جیسے گھنے بادلوں کی اوٹ سے سورج جھانکتا ہے جیسے یالیوں کے اندھیروں میں کوئی کرن بھڑکتی ہے۔

بہادر شاہ ظفر اور انکا عہد ۵۱۸

تذکرہ نویسوں کی چشم پوشی اس باب میں جناب مفتی انتظام اللہ شہابی صاحب کی گواہی بھی دیکھتے چلیں تحریر فرماتے ہیں

ہندوستان کی سیاسی تحریک میں علماء کا جقد رشاد کا نام اور جذبہ وطنیت کا مظاہر ہے اسکی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی الیٹ انڈیا کے اقتدار و قلب استقلال کے خلاف سب پہلے علماء ہی کی آواز مخالفت اٹھی انھیں علماء کا پہلا شخص جو سرکٹ میدان عمل میں آیا احمد اللہ شاہ مدداسی تھا اسکے ہموا کثیر العلماء آئے جو ایک طرف درس و تدیس، تصنیف و تالیف میں لگے ہوئے تھے تو دوسری طرف سیاست ملکی میں جھم لے رہے تھے۔ ان میں نمایاں شخصیت مولانا امام بخش مہبائی شہید مولانا فضل حق خیر آبادی مفتی صدر الدین آزادہ ذاب شیفہ، مولوی عظیم اللہ کانپوری، منیر شکوہ آبادی تھے۔ مگر افسوس کہ ان بزرگوں کے سیاسی حالات تذکرہ نویسوں نے چشم پوشی کی (غدر کے چند ملک و مفتی انتظام اللہ شہابی)

جوش و ہایت اس میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ ان بزرگان دین کی کردار کشی میں نظریاتی اختلاف کو بہت بڑا دخل تھا۔ چنانچہ جناب رئیس احمد جعفری ندوی ایک مقام پر بطور وضاحت ان جاتید و مصنفین مؤرخین کے بیدردانہ رویہ کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں

مولانا جعفر تھانیسری نے سب کچھ لکھا ہے لیکن رفقا و زندان کے ذکر سے بالکل گریز کیا ہے حالانکہ اس دور میں چوٹی کے مسلمان انکے ساتھ کالے پانی میں ابتلا کی زندگی بڑے استقلال و وقار کیساتھ بسر کر رہے تھے۔ حق بات یہ ہے کہ مولانا پر دو آناہ اور تحریک و ہایت کا جوش اس قدر نمایاں اور غالب تھا کہ وہ اپنے اور اپنی تحریک کے سوا کسی اور چیز کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتے تھے (بہادر شاہ ظفر اور انکا عہد ص ۱۳)

غور فرمائیے کہ جہاں انانیت اور خود غرضی، تعصب و تنگ نظری کا یہ عالم ہو۔ اور جن لوگوں کی خود پسندی اس انتہا کو پہنچ چکی ہو ان سے اور انکے تعلقین سے کسی مورخانہ دیانتداری کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ جناب رئیس ہی فرماتے ہیں۔

سر سید نے محمود خاں کا نام ”درنا محمود“ اسی طرح شمس العلماء مفتی ذکار اللہ نجت خاں کو ”کم نجت خاں“ کے نام نامی اسم گرامی سے یاد کرتے ہیں لیکن یہ معمول جاتے ہیں شکسیر کے الفاظ میں گلاب کے پھول کو جس نام سے بھی یاد کرو گلاب کا پھول ہوگا (بہادر شاہ ظفر اور انکا عہد ص ۸۳)

بیدردانہ انداز تحریر جناب رئیس احمد صاحب جعفری نے ان صاحبان بیعت و قلم کے معاندانہ انداز کی ایک توضیح بھی فرمائی ہے جس سے کم از کم یہ ناچیز اتفاق نہیں کر سکتا۔ جناب رئیس فرماتے ہیں۔

نجت خاں اور مولانا خیر آبادی کے احوال و سوانح، واقعات و حوادث، کارناموں اور سرگرمیوں کی تفصیل معلوم کرنا آسان نہ تھا۔ ان کا ذکر عام دلہشت اور سرسبکی کے باعث اُنکے مدارج اور ثنا خواں بھی ڈر ڈر کر اور چبا چبا کر کرتے ہیں۔ آج ہم اندازہ نہیں کر سکتے کہ غدر کا ذکر بھی کتنا دوح فرسا تھا اور ان شخصیتوں کا تذکرہ جنھوں نے اس انقلابی تحریک میں مردانہ و احصہ لیا تھا اپنی جان سے ہاتھ دھونا تھا انگریزوں کی نازک و دماغی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اور انداز اسی بات پر او معمولی سے معمولی شبہ پر جو رستم کی بارش شروع کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اکابر کا کہیں ذکر نہیں ملتا اور اگر کہیں ملتا بھی ہے تو مخالفانہ اور معاندانہ انداز میں۔ کتاب مذکور ص ۸۳

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جنگ آزادی کے اس خونچکا دور میں عظمت کے ان بلندیناروں کا ذکر مصائب و الام کا ایک پہاڑ توڑ سکتا تھا۔

مگر یہی بات مجاہدین آزادی کی عظمت و بڑائی کا نشان بن جاتی ہے۔ جنکے ذکر سے استعاری قوتیں رزا اٹھتی تھیں۔ جنکے نام سے گوردوں کے مزاج برہم ہو جاتے تھے۔ جن کی قد آور شخصیتوں کے

سامنے ہمارے کی چوٹیاں پست نظر آتی تھیں۔ جنکے عزم و جدوت کے سامنے ہمندر پار کی مخلوق ہتھرتی تھی۔ مجھ لایسے لوگوں کو فرنگی اور انکے سائیہ عاطفت میں بیٹھنے والے حاشیہ نشین کس طرح پسند کر سکتے تھے۔ ان مصنفین کیلئے کیا ضروری تھا کہ ان کا استغناء ہی کرتے اور انکی توہین و تذلیل کو اپنے لئے ذریعہ نجات بناتے مگر پھر اے ایسا نہ کرتے تو سید احمد سے خال کس طرح کہلاتے۔ منشی ذکا د اللہ سے شمس العلماء مفتی ذکا د اللہ کیسے بیٹے و ظالمت کس طرح ملتے۔ جاگیریں کس صلہ میں حاصل ہوتیں۔

ہجرت تو یہ ہے کہ آزادی کے اس دور میں بھی انھیں حضرات کی ذریات کا ایک طبقہ صرف نظر باقی اختلاف کی وجہ سے تاریخ سے ہولناک بد دیانتی کر رہا ہے۔

اس کے باوجود روشنی پھیل رہی ہے۔ اور پھیلتی رہے گی تا آنکہ "ان" افق اجالا پھیل جائے گا آج ہم بیسویں صدی میں ان تحریکات اور حوادث و واقعات کا جائزہ لیتے ہیں تو اس دور کے سوانح نگاروں کے متعلق اچھی رائے قائم نہیں کر پاتے۔

یہاں اسکے علاوہ کیا کہا جاسکتا ہے کہ کبھی تولائے گی باد صاپیم ترا ہوا کے رخ پر نشیمن بنائے بیٹھے ہیں

ابن عبد الوہاب اور برطانوی جاسوس ہمفرے

نزیر قلم کتاب پاک و ہند کی چند اسلامی تحریکیں اور علما "حق" مکمل ہو چکی تھیں کہ "ہمفرے کے اعترافات" نامی کتاب جناب مولانا محمد انصاری صاحب اشرفی کی وساطت سے نظر سے گزری اور کتاب میں مزید ایک باب کا اضافہ ہو گیا۔ اگرچہ میں نے اپنی کتاب "پاک و ہند کی چند اسلامی تحریکیں اور علما "حق" میں بے شمار شواہد کیساتھ یہ ثابت کر دیا ہے کہ "نجد کی دہائی تحریک" برصغیر کی تحریک جہاد یا دوسرے لفظوں میں "دہائی تحریک" مشرق وسطیٰ کی صیہونی اور بھائی تحریک اور اسی قسم کی دوسری تحریکیں اسلام کے خلاف انتہائی خوفناک اور گھناؤنی سازشیں تھیں جو انکے واقع ہونے سے بھی ساہا سال پہلے ایک طویل منصوبے کے تحت مسلم علاقوں کو غیر مسلموں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔

(مثلاً مدینہ یہودیوں کو، اسکندریہ عیسائیوں کو، یزد پارسیوں کو، عمارہ صابیوں کو، کرمان شاہ علی اللہیوں کو، موصل یزیدیوں کو، اور بوشہر سمیت خلیج فارس کے قرب و جوار کے علاقے ہندوؤں کو۔

سوینا.... اور منقطع خوارج کے حوالے کر نا ہی نہیں بلکہ مادی امداد جنگی ساز و سامان اور فوجی اور سیاسی ماہرین کے ذریعے انھیں مضبوط بنانا بھی ضروری ہے (ہمفرے کے اعترافات ص ۱۱۷)

ہمفرے کون تھا؟ مختصر یہ کہ ہمفرے برطانوی سامراج کا ایک سلیجھا ہوا جاسوس تھا اسکو اور اس جیسے بے شمار افراد کو گورنمنٹ برطانیہ اور اسکے ساتھ ہی دیگر استعماری قوتوں مثلاً روس فرانس وغیرہ نے نو آبادیات قائم کرنے اور انکو استحکام عطا کرنے کیلئے بطور خاص تیار کیا گیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنوں نے ہمفرے کی یادداشتوں کو "اسپیگل" نامی رسالہ میں شائع کرنا شروع کیا پھر فرانسیسی زبان میں یہ یادداشتیں شائع ہوئیں اسکے بعد ایک لبنانی دانشور نے عربی میں اس کا ترجمہ کیا اور اب یہ "ہمفرے کے اعترافات" کے نام سے اردو میں (انجمن فوجوانان پاکستان گارڈن ٹاؤن لاہور) نے شائع کیا ہے کتاب پڑھنے سے جہاں سامراجی قوتوں کی درندگی و خہ آشامی، فریب کاریوں اور عیاریوں کا پتہ چلتا ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کس طرح دنیا بھر میں پھیلی ہوئی مسلم حکومتوں میں بد امنی و خلفشار پیدا کرتے تھے اور یہ کہ یہ لوگ کس طرح اسی ملک کے مقتدر لوگوں کو اپنی مقصد برآری کیلئے استعمال کرتے تھے۔ بلکہ اب بھی کر رہے ہیں۔

ابن عبد الوہاب کی کہانی ہمفرے کی زبانی ۱۔ یوں تو ابن عبد الوہاب کی کہانی طویل ہی نہیں بلکہ طویل تر ہے اور اسے سلف و خلف نے بڑی وضاحت سے لکھا ہے اور اسکی فطرت و جبلت اور اسکی خون ریزی و قساوت قلبی کے واقعات بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ مگر اس برصغیر میں جہاں مرزا قادیانی کو نبی ماننے میں کوئی الجھن محسوس نہیں کی گئی وہیں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس بدنام زمانہ انگریزوں کے ایجنٹ ابن عبد الوہاب کو امام تک کہنے سے ذرا بھی نہیں جھجکتے۔ انھیں ابن عبد الوہاب کی ہر ادا ایمان افروز اور درج پرور اور شرع محمدی میں شر اور نظر آتی ہے۔

مثلاً جناب مسعود عالم صاحب ندوی اپنی کتاب "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" میں لکھتے ہیں (نجد کی دعوت کے علمبردار شیخ الاسلام محمد ابن عبد الوہاب کی نسبت کرنا ہو تو محمدی کہنا چاہئے.... البتہ عزم و عمل کی مردہ قوتوں کو بیدار کیا، بیجان پیکروں میں زندگی کی حرارت ڈال دی اور پورے خطے کو اسلامی رنگ میں شربور کر دیا یہ ایسا گناہ ہے جسے شاطران فرنگ اور انکے ہواخواہ معاف نہیں کر سکتے۔ (ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۱۳)

اور اب آپ بھیجیں گے انکے شیخ الاسلام کس قماش کے شیخ تھے۔ اور یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ انگریزوں کا ہمنوار ہوا خواہ کون تھا۔ اور کن لوگوں کے ساتھ انگریزوں کی گاڑھی چھتی تھی اور وہ کون لوگ ہیں جنکے آباء اجداد (یعنی سید احمد بریلوی، مولوی اسماعیل دہلوی وغیرہ وغیرہ) نے مسلمانوں پر انگریزوں کو ترجیح دی اور انھیں کے متبعین و متقلدین نے قیام پاکستان کی وقت مسلمانوں پر ہندوؤں کو ترجیح دی تھی۔ ہم فرے لکھتا ہے کہ بصرہ میں ان دنوں میں ترکھان کی دوکان پر کام کرتا تھا، میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو وہاں آتا جاتا رہتا تھا اور ترکی، فارسی، عربی زبانوں میں گفتگو کرتا تھا وہ ایک اونچا اڑنوالا، ایک جاہ طلب اور نہایت غصیلہ انسان تھا۔۔۔ شیخ محمد کے نزدیک حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی مکاتیب فکر میں سے کسی مکتب کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی وہ کہتا تھا خدا نے جو کچھ قرآن میں کہ دیا ہے بس یہی ہمارے لئے کافی ہے (ہم فرے کے اعترافات انگریزوں کے مقاصد کی تکمیل کیلئے مناسب شخصیت)۔ (محمد بن عبدالوہاب سے میل جول اور ملاقاتوں کے ایک سلسلہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ برطانوی حکومت کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کیلئے یہ شخص بہت مناسب دکھائی دیتا ہے۔ اسکی اونچا اڑنے کی خواہش، جاہ طلبی، غرور، علماء و مشائخ اسلام سے اسکی دشمنی اس حد تک خود مری کہ خلفاء راشدین بھی اسکی تنقید کا نشانہ بنیں۔ اور حقیقت کے برابر خلاف قرآن و حدیث سے استنادہ اسکی کمزوریاں تھیں جس سے بڑی آسانی سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔۔۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب ابو حنیفہ کی تحقیر کرتا تھا اور اسے ناقابل اعتبار سمجھتا تھا۔ محمد کہتا تھا میں ابو حنیفہ سے زیادہ جانتا ہوں اسکا دعویٰ تھا کہ نصف صحیح بخاری بالکل لچر اور سیوہ ہے۔ اعترافات ص ۱۵)

ابن عبدالوہاب کی متعہ بازی (عجیب بات یہ ہے کہ ابن عبدالوہاب جسے شیخ الاسلام کا خطاب دیتے ہوئے۔ کچھ لوگوں کی زبانیں نہیں غفلتی ایک برطانوی جاسوس سے بار بار علمی مباحث میں مار کھا جاتا ہے اور متعہ پر راضی ہی نہیں ہوتا بلکہ اسکا عملی مظاہرہ بھی کرتا ہے۔ اب یہاں اسکے علاوہ کیا کہا جاسکتا ہے کچھ گروئی اینٹ دھندل برولی۔ ہم فرے لکھتا ہے کہ جب شیخ متعہ کرنے پر راضی ہو گیا تو (اس گفتگو کے فوراً بعد میں اس بد قماش نصرانی عورت کے پاس گیا جو انگلستان کے نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کی طرف سے بصرہ میں عصمت فروشی

پر مامور تھی اور مسلم نوجوانوں کو بے راہ ردی پر ابھارتی تھی۔ میں نے اس سے تمام واقعات بیان کئے جب وہ راضی ہو گئی تو میں نے اس کا عاضی نام رکھا۔ اور کہا کہ میں شیخ کو لیکر اسکے پاس آؤں گا۔ مقررہ دن میں شیخ محمد کو لیکر صفیہ کے گھر پہنچا، ہم دونوں کے سوا وہاں اور کوئی نہیں تھا محمد نے ایک اشرفی مہر پر ایک ہفتہ کیلئے صفیہ سے عقد کیا مختصر یہ کہ میں باہر اور صفیہ اندر سے محمد بن عبدالوہاب کو اپنے آئندہ کے پروگراموں کیلئے تیار کر رہے تھے صفیہ نے احکام دین کی پامانی اور آزادی دینے کا پکیف مزہ محمد کو چکھا دیا تھا۔ (ہم فرے کے اعترافات ص ۵۵)

ابن عبدالوہاب کی شراب نوشی (یہاں شراب کے بارے میں بھی ہم فرے اور کچھ لوگوں کے شیخ الاسلام کی بحث ہوتی رہی بالآخر ابن عبدالوہاب پانی ملا کر شراب پینے کی حلت پر راضی ہو گیا ہم فرے کہتا ہے (میں نے شراب سے متعلق گفتگو کو صفیہ کے گوش گزار کیا اور اسے تاکید کی کہ موقع ملتے ہی محمد کو لکٹر میں چور کر دو اور جتنا ہو سکے شراب پلاؤ۔ دوسرے دن صفیہ نے مجھے اطلاع دی کہ اس نے شیخ کیساتھ جی کھول کر شراب نوشی کی یہاں تک کہ وہ آپ سے باہر ہو گیا اور چہنچہ چلانے لگا۔ رات کی آخری گھڑی میں کئی مرتبہ میں نے اس سے مقاببت کی اور اب اس پر نقابت کا عالم طاری ہے اور چہرے کی آب و تاب ختم ہو چکی ہے خلاصہ کلام یہ کہ میں اور صفیہ پوری طرح محمد پر چھپ چکے تھے۔ اس منزل پر مجھے نوآبادیاتی علاقوں کے وزیر کی وہ سنہری بات یاد آئی جو اس نے مجھے اوداع کہتے وقت کہی تھی اس نے کہا تھا ہم نے اسپین کو کفار (مراہل اسلام) ہیں) سے شراب اور جوئے کے ذریعے دوبارہ حاصل کیا اب انھیں غلامتوں کے ذریعے دوسرے علاقوں کو بھی پامردی کیساتھ لینا ہے۔ کتاب مذکور ص ۵۵-۵۶)

ابن عبدالوہاب کی نماز بھی گئی، اور یہودی بڑکی اسی سے متعہ (نارک الصلوٰۃ متعہ باز شیخ الاسلام، شراب خوری اور متعہ بازی بھی زنا کاری کا جو نتیجہ نکلتا تھا وہ نکل کے رہا چنانچہ ہم فرے لکھتا ہے (جبکہ نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے نماز کی پابندی چھوٹ گئی اب وہ کبھی نماز پڑھتا اور کبھی نہ پڑھتا خاص طور سے صبح کی نماز غالباً اس نے ترک ہی کر دی تھی ص ۵۷)

پھر ہم فرے لکھتا ہے میں نجف اشرف اور کربلا وغیرہ سے جب بصرہ پہنچا تو وہ (ترکی جانے پر بلند تھا کہ وہاں جاکر اس شہر کے بارے میں معلومات کرے میں نے بڑی سختی سے اسے اس صفر سے باز رکھا اور کہا مجھے ڈر ہے کہ تم وہاں جاکر کوئی النی سیدھی بات نہ کر دیتے جس سے تم زوال کا ازام غاندہ ہو

اور بتا رہا ہوں رائگاں جائے۔ لیکن سچی بات یہ تھی کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہاں جا کر وہ بعض علماء اہلسنت سے کوئی رابطہ قائم کرے کیونکہ اس میں اس بات کا خطرہ تھا کہ کہیں وہ لوگ اپنی محکم دلیوں کے ذریعے دوبارہ اسے اپنے جال میں نہ پھانس لیں (۱۷)۔

بالآخر ہمبرے نے ابن عبدالوہاب کو اصفہان جانے پر راضی کر لیا اور اسکے ساتھ ہی کچھ رقم اور ایک گھوڑا بھی دیا۔ (اسکے ساتھ ہی صفیہ بھی کچھ عرصہ بعد اصفہان آئی اور اس نے مزید دو مہینے کیلئے شیخ سے متعلقہ شہر کے سفر میں وہ اسکے ساتھ نہیں تھی بلکہ عبدالکریم (جو ایک بڑا نو جوان تھا) نے اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا شہر لڑ میں عبدالکریم نے شیخ کیلئے صفیہ سے بھی زیادہ خوبصورت لڑکی کا انتظام کیا تھا۔ اور وہ شہر کے ایک یہودی خاندان کی حسین و جمیل لڑکی تھی جس کا نام آسیہ تھا (۱۸-۱۶)۔

انگریزوں کا مناسب ترین ایجنٹ ابن عبدالوہاب ہمبرے لکھتا ہے (محمد پرست تو آبادیاتی وزارت کا سب سے اہم مسئلہ تھا اس نے بڑی شدت سے تاکید کی تھی کہ میں محمد کو ایک منظم منصوبے کے تحت ان امور سے آگاہ کروں جنہیں آئندہ چل کر اسے ہمارے لئے انجام دینا ہے وہ بار بار اس بات کا اعتراف کر رہا تھا کہ عظیم برطانیہ کیلئے میری تمام خدمات شیخ محمد جیسے شخص کی جستجو اور اس پر اپنا اثر و نفوذ قائم کرنے کے مقابلہ میں پاسبانگ بھی نہیں منہ) پھر کچھ آگے چل کر ہمبرے لکھتا ہے کہ (میرا سفر صرف اس مقصد کیلئے تھا کہ محمد ابن عبدالوہاب کو نئے دین کے اخبار کی دعوت پر آمادہ کروں) (۱۹)۔

دیکھ کر اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ محمد ابن عبدالوہاب قابلِ بھروسہ اور نو آبادیاتی علاقوں کی وزارت کے پروگراموں کو رد و فعل لانے کیلئے مناسب ترین آدمی ہے۔ اسکے بعد سکرٹری نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میں محمد کیساتھ بالکل واضح اور دو ٹوک الفاظ میں گفتگو کرتی ہے، کیونکہ ہمارے عمائد اصفہان میں اس سے بڑی طرح کیساتھ پہلے ہی گفتگو کر چکے ہیں اور وہ انکی باتوں کو مان چکا ہے۔ مگر اس شرط کیساتھ کہ اسے فتاویٰ حکومت کے مقامی عمائد، علماء اور متعصب لوگوں کے ہاتھوں آئینے خطرہ سے بچایا جائے، اور اسکی حمایت اور تحفظ کا بھرپور انتظام کیا جائے۔

... حکومت برطانیہ نے شیخ محمد ابن عبدالوہاب کو اسلئے سے اچھی طرح پس کرنے کے بعد ضرورت کے موقع پر اسکی مدد کی تاکید کی تھی اور شیخ ہی کی مرضی کے مطابق جزیرہ العرب میں واقع نجد کے قریب علاقے کو اسکی حاکمیت کا پہلا مقام قرار دیا تھا (۲۰)۔

انگریزوں کے پھر خطرناک نکات اور ابن عبدالوہاب ہمبرے کے اعتراضات کے مطابق نو آبادیاتی وزارت نے ابن عبدالوہاب کیلئے کچھ نکات مرتب کئے تھے جن پر ابن عبدالوہاب کو بہر صورت عمل کرنا تھا اور یقیناً ابن عبدالوہاب نے عملاً ثابت کر دیا کہ وہ قابلِ بھروسہ ہے اور وہ انگریزوں کے مفکرہ ہدف پر بہر حال پورا اترے گا۔ وہ کچھ نکات حسب ذیل ہیں۔

(۱) اسکے (یعنی ابن عبدالوہاب کے) مذہب میں شمولیت اختیار نہ کرینے والے مسلمانوں کی تکفیر اور انکے مال، اعزت اور آبرو کی بربادی کی رو اسبھنا، اس ضمن میں گرفتار کئے جانے والے مخالفین کو بردہ فرشتی کی ماکیت میں کنیز و غلام کی حیثیت سے پہنچنا۔

(۲) بت پرستی کے بہانے بصورت امکان خانہ کعبہ کا انہدام اور مسلمانوں کو فریضہ حج سے روکنا اور حاجیوں کے جان و مال کی غارت گری پر قبائل عرب کو اکساتا۔

(۳) عرب قبائل کو عثمانی خلیفہ کے احکامات سے سرتابی کی ترغیب دینا۔ اور ناخوش لوگوں کو ان کے خلاف جنگ پر آمادہ کرنا۔ اس کام کیلئے ایک ہتھیار بند فوج کی تشکیل، اثرات حجاز کے اقرار اور اثر و نفوذ کو توڑنے کیلئے انھیں ہر ممکن طریقے سے پریشانیوں میں مبتلا کرنا۔

(۴) پیغمبر اسلام (صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم) کے لئے جانشینوں اور کل طوہر پر اسلام کی برگزیدہ شخصیتوں کی اہانت کا سہارا لیکر اور اسی طرح شرک و بت پرستی کے آداب و رسوم کو مٹانے کے بہانے مکہ اور مدینہ اور دیگر شہروں میں جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کی زیارت گاہوں اور مقبروں کی تباہی۔

(۵) جہاں تک ممکن ہو سکے اسلامی ممالک میں فتنہ و فساد شورش اور بد امنی کا پھیلاؤ۔

(۶) قرآن میں کمی بیشی پر شاہد احادیث و روایات کی رو سے ایک جدید قرآن کی نشر و اشاعت (۱۹۱۱ء) تقریباً ان کچھ نکات کی تکمیل کے بعد گورنمنٹ برطانیہ نے سوچا کہ اب سیاسی اعتبار سے بھی جزیرہ العرب میں کوئی کام ہونا چاہیے یہی وجہ تھی کہ اپنے عمائد میں سے محمد ابن مسعود کو محمد ابن عبدالوہاب کیساتھ اشتراک عمل پر مامور کیا (۲۱)۔ پھر کیا ہوا یہ ایک انتہائی دردناک داستان ہے۔ پورا جزیرہ العرب خون سے لبریز ہو گیا اور مزارات و مقابر پامال کر دیے گئے۔ جسے بزرگان دین نے نہایت بے لطف کیساتھ جہاں کیا ہے۔ اور ہم نے اپنی اسی کتاب پاک دہندگی چند اسلامی تحریکیں اور علمائے حق میں کافی حد تک ان مسائل کی وضاحت کی ہے۔

جہاد اور جہادی

جناب سید احمد بریلوی اور انکی تحریک جہاد اور انکے مجاہدین کے بارے میں جہاں تک احوال و واقعات کا تعلق ہے ان میں حقائق کم اور افسانے زیادہ ہیں۔ ان جہادی شخصیات پر جو ڈھیروں مضامین مقالے اور کتابیں لکھی گئیں اور لکھی جا رہی ہیں انکے بیشتر واقعات کو زیب داستان سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

آج اس دور میں جب پروگنڈے اور نشر و اشاعت کے زور پر جناب مودودی صاحب تحریک قیام پاکستان میں قائد اعظم کے شریک سفر کہلا سکتے ہیں۔ اور انکی جماعت پاکستان کی سب سے بڑی جماعت کہلا سکتی ہے۔ اور اسی پاکستان میں جسکے قیام کی سخت ترین مخالفت کرنوالے مفتی محمود جیسے لوگوں کیلئے ”پاکستان کے قائد اعظم مفتی اعظم مفتی اعظم“ کے نعرے لگ سکتے ہیں۔ اور جناب حسین احمد مدنی جیسے پاکستان دشمن لوگوں کیلئے پاکستانی ادارہ نشریات سے مدحت سرائی ہو سکتی ہے۔ اور اس ارض پاک کا نمک پانی کھاپی کر ”روشن مستقبل“ جیسی گمراہ کن کتابیں شائع کی جا سکتی ہیں۔ تو کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔

پروگنڈے کی خوفناک کہانی محمد علی قصوری کی زبانی

پڑھے لکھے لوگوں کیلئے مولانا محمد علی قصوری کوئی غیر معروف شخصیت نہیں ہیں مولوی ہونے کیساتھ ساتھ وہ کیمبرج کے تعلیم یافتہ تھے۔ مسلک اہلحدیث تھے۔ اور خود بعد کے مجاہدین میں شامل تھے اسلئے انکی کہی ہوئی بات بڑی حد تک وقعت و اہمیت رکھتی ہے۔ پروگنڈے کی کہانی انکی کتاب ”مشاہدات کابل و یاغستان“ میں ص ۱۱۹ سے ص ۱۲۱ تک پھیلی ہوئی ہے جسکے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں اور اندازہ کریں کہ یہ دینی اور مذہبی لوگ اس باب میں کہاں تک جا پہنچے ہیں۔

گو جماعت مجاہدین کا مرکز مردہ ہو چکا تھا مگر اسکے پروگنڈہ کا نظام ابھی تک بہت وسیع اور عمدہ تھا جسکا نتیجہ یہ تھا کہ سیدھے سادے مسلمان جنھیں کتاب و سنت کیساتھ عشق ہوتا تھا اس پر پروگنڈہ کا آسانی سے شکار ہوتے تھے ص ۱۱۹

جماعت مجاہدین کے مؤسسین نے شروع سے جماعت کے قیام و بقا کیلئے ایسا منظم سسٹم بنایا تھا کہ اگر نزیول کا تشدد اور غدر کے مقدمات بھی اس نظام کو نہ توڑ سکے۔ چنانچہ ہندوستان میں جگہ جگہ مختلف ادارے تھے جو نظام تعلیمی مشاغل میں منہمک تھے اور مدرسوں کے اور خیراتی اداروں کے ذریعہ کافی رقم جمع کرتے تھے۔ اس رقم کا ایک معتد بہ حصہ سرحد پار امیر المجاہدین کے پاس جہاد کیلئے پہنچ جاتا تھا ص ۱۱۹۔

مگر تعجب یہ ہے کہ باوجود اس قدر امین اور بے غرض ہونے کے وہ جماعت کیلئے حیرت انگیز جھوٹا پروگنڈہ کرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسان اضداد کا پتلا ہے۔ یہ نقاد میں نے اکثر بہترین کمیونسٹ ورکرز میں بھی دیکھا ہے۔ اور مجھے حیرت ہوتی ہے ایک بے غرض اسیار کا پتلا امین دویا نندو شخص کینز کی سی جماعت کیلئے بے دریغ جھوٹا پروگنڈہ کرنے سے نہیں جھجکتا بلکہ اسے عین ثواب سمجھ کر کرتا ہے ص ۱۲۱

(مشاہدات کابل و یاغستان از ص ۱۱۹ تا ص ۱۲۱)

اسکے بعد بھی ان لوگوں کے غلط پروگنڈوں کی بابت بہت کچھ لکھا ہے۔ مثلاً سہی کہ میرا نام لے کر ہندوستان پر فوری حملہ کے متعلق بڑا غلط پروگنڈہ کرتے تھے اور خوب جی بھر کے چنڈہ جمع کرتے تھے۔ ان حضرات کی بلکہ یہی عادت اب بھی ہے دوسرے لوگوں کے خلاف دل کھول کر غلط پروگنڈہ کرتے ہیں اور سال بھر چنڈہ جمع کرتے رہتے ہیں۔

بہر صورت جو دیوبند پاکستان کا دشمن اول تھا اسکے جشن کے سلسلے میں لاہور کا اسٹیشن سجایا جاسکتا ہے۔ (جبکہ اس کی صدارت بھی اندرا گاندھی نے کی) خصوصی ٹرینیں چلائی جاسکتی ہیں۔ بطور خاص اجازت نامے مرحمت فرمائے جاسکتے ہیں وغیرہ وغیرہ اگر گویم ذباں سوزد

یہاں تک کہ پروفیسر عبدالقیوم صاحب نے اپنے مضمون ”تجدید و احیائے ملت“ میں تو گویا مولوی محمد اسماعیل صاحب دہلوی کو پاکستان کا پہلا مصور قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

نجد میں امام عبدالوہاب کی کامیابی نے شاہ اسماعیل کی ہمت و جرات اور بھی بڑھادی میدان جنگ منتخب ہوا قرقعہ بالاکوٹ کے نام نکلا۔ ہندوستان بھر کے مجاہدین

وہاں حج ہونے لگے اور اپنے آباد اجراء کے خیالات کے مطابق شاہ اسماعیل ہندوستان میں "پاکستان" یعنی خلافت اسلامیہ کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے۔
(از امتیاز حق ص ۹) (شاہ اسماعیل شہیدؒ)

حالانکہ علمائے دیوبند ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہاں بیان نجد سے شاہ اسماعیل کا تعلق ثابت نہ ہو سکے۔

پہلوں کی، بلکہ اخلاف نے اپنے اسلاف کی، اصغرین نے اپنے اکابرین کی تلامذہ نے اپنے اساتذہ کی تلمذیہ و تفہیمی کی ہے جسکی وجہ سے ان حضرات کی تحریریں مشتبہ اور ناقابل قبول ہو جاتی ہیں۔
دور حاضر کے محققین نے تحریک جہاد کے باب میں جہاں پہلوں کی تلمذیہ کی ہے۔ وہیں اپنی تخلیق کی بنیاد پر غیر مطبوعہ قلمی نسخوں، نایاب دستاویزات اور ایسے مکتوبات پر لکھی ہے جہاں تک کسی غیر کی رسائی تقریباً ناممکن ہے۔

اور حد یہ ہے کہ پہلے مذکورہ نگاروں پر جو قرب زمانہ اور شرک حال ہوئی وجہ سے ماخذ قرار دیے جاسکتے ہیں۔ ان پر تحریف کا الزام لگایا جا رہا ہے حالانکہ وہی حضرات ان نئے مورخین سے پہلے بلکہ ان تک معتمد اور ثقہ تھے ان حالات میں دور حاضر کے سوانح نگاروں کی باتیں کس طرح قابل قبول ہو سکتی ہیں۔ جبکہ یہ مؤرخین حضرات بھی اُنھیں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ویسے بھی قدیم معتمد لوگوں کو جھٹلانا بڑا غلط رجحان ہے۔

دلچسپ باتیں یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ آج تک جتنے بھی سید صاحب کے مؤرخین گزے ہیں تقریباً سبھوں نے سید صاحب کی عملی کم نامگی اور پڑھنے لکھنے میں عدم رغبتی کا اقرار کیا ہے۔ جناب شیخ اکرام لکھتے ہیں۔

مولانا سید احمد ۲۹ نومبر ۱۹۷۲ء کو رائے بریلی میں پیدا ہوئے ان کی ابتدائی زندگی پردہ راز میں ہے لیکن اتنا معلوم ہے کہ ایام طفلی میں تحصیل علم سے آپ کو رغبت نہ تھی اور مکتب میں تین چار سال گزارنے کے بعد قرآن مجید کی چند سورتوں کے سوا آپ کو کچھ یاد نہ ہوا۔

(موج کوثر ص ۱۵)

جوانی میں آپ دہلی تشریف لے گئے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُنھوں نے شاہ عبدالقادر صاحب کے پاس بھیج دیا۔

وہاں آپ نے کچھ غرض صرف و نحو پڑھی قرآن مجید کا اردو ترجمہ بھی مطالعہ کیا۔ لیکن پڑھنے لکھنے میں کوئی نمایاں ترقی نہ کی۔
(حوالہ مذکور)

تضادات دوسرے مسائل کی طرح اس مسئلہ جہاد میں بھی ان حضرات کے بیان کردہ احوال و واقعات میں اتنا زبردست تباہی اور تضاد پایا جاتا ہے کہ کوئی بھی ذی فہم قاری ذہنی غلطی میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حتیٰ کہ یہ مورخین حضرات آج تک یہ فیصلہ بھی نہ کر سکے کہ سید صاحب اور اُنکے ساتھیوں کے جہاد کا درجہ کدھر تھا۔

اور یہ جہاد انگریزوں سے تھا یا سکھوں سے یا سرحد کی طرف صرف تبلیغی دورہ تھا۔ اور یہ کہ سکھوں اور انگریزوں سے پہلے چٹھانوں کو کچل دینا کیوں ضروری تھا؟
یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس سلسلے کے بہت سے اہم مسائل میں بعد والوں نے

جناب ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں

جب آپ کی عمر سال کی ہوئی تو شرف کے دستور کے مطابق آپ مکتب میں بٹھائے گئے لیکن لوگوں نے تعجب سے دیکھا کہ آپ کی طبیعت خاندان کے اور لڑکوں اور اپنے ہم عمروں کے برخلاف علم کی طرف راغب نہیں اور آپ پڑھنے پڑھانے کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ تین سال مکتب میں گزر گئے اور باوجود استاد کی توجہ و شفقت اور بزرگوں کی تاکید و فہمائش کے صرف قرآن مجید کی چند سورتیں یاد ہو سکیں اور مفر دمرکب لفاظ لکھنا سیکھ گئے۔

سیرت سید احمد شہید ص ۱۹ جلد اول

ادب مرزا حیرت کی بھی سنئے۔

کریا کا پہلا مصرعہ خاصا دعائیہ ہے مگر یہ بھی بزرگ سید کو تین دن میں یاد ہوا تھا اس پر بھی کبھی کریا بھول گئے تو کبھی ہر حال ماکو دل سے ٹھوکر دیا.... میاں جی نے بہتر اسٹریٹیکا اور مغز پچی کی بزرگ سید کے کان پر چل بھی نہیں رہی تھی۔

(خیات طیبہ جز دوم ص ۲۳۶)

مگر مسلمانوں کا روشن مستقبل کے عظیم مصنف جناب سید طفیل منگوری ایک اور ہی داستان سناتے ہیں۔

سید صاحب بہت ذہین تھے اور انکی علمی ترقی کی رفتار بہت تیز تھی۔ مگر ان میں روحانیت بڑھی ہوئی تھی اس لئے درس چھوڑ کر انھیں طریقت کی تعلیم دی گئی۔

(مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۱۲۶)

پوچھنا صرف یہ ہے کہ کیا یہ بھی کوئی ایسا مسند تھا جس میں اختلاف رائے ہوتا۔ ان حوالوں کے پیش نظر جہاں تک ایک تاریخی سمجھ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر مصنف نے جو سمجھ میں آیا لکھ دیا اور حقیقت حال کیا ہے؟ اسکو سمجھنے، پرکھنے کی کوشش نہیں کی گی۔

پھر یہ کہ دیگر مسائل کی طرح ان حضرات نے تاریخ میں بھی "قانون ضرورت" کو ترجیح دی ہے۔ یعنی جب ضرورت تھی کہ یہ کہا جائے کہ سکھوں سے جنگ تھی تو کہہ دیا گیا کہ ان لانیے بالوں والے

سکھوں سے جنگ تھی۔ اور جب سکھ بھی ہندوں کی طرح براہِ ران وطن بن گئے۔ اور انگریزوں سے محنت لگی تو کہہ دیا گیا جنگ انگریزوں سے تھی۔ سکھوں کا نام بلاوجہ درج کر دیا گیا ہے۔ اور اسے زیادہ کاڑھا کرنا ہوا تو کہا گیا "مرموز" طریقہ استعمال کیا گیا ہے یعنی سکھ بول کر انگریز مراد تھی۔ اللہ وناہید راجون بہر صورت اس باب میں ہمارا موقف غیر مبہم اور نقطہ نظر واضح ہے کہ سید صاحب اور ان کے ساتھیوں کا مقصد بخدی طرز پر "دولہائی اسٹیٹ" کا قیام تھا جسکی تائید سید صاحب کے موصوفین بھی فرماتے ہیں حتیٰ کہ انگریزوں سے انھوں نے ایک دن بھی جنگ نہیں کی (جبکہ تفصیلی جائزہ آگے آ رہا ہے)

سکھوں سے بھی باسرمجوری جنگ ہوئی۔ البتہ شروع سے آخر تک سرحدی پٹھانوں پر بدعت اور شرک و کفر کے فتوے لگاتے رہے اور ان سے جنگ و جدال بنام جہاد کرتے رہے۔ اور غیور پٹھانوں کی بہو بیٹیوں سے قوت اور ہتھیاروں کے زور پر زبردستی نکاح کا شوق پورا فرماتے رہے۔

مولوی اسماعیل کا عزم خونریزی
سرحدی مسلمانوں کے لئے مولوی اسماعیل کے عزائم انتہائی خطرناک تھے۔ ان کے موصوفین کے بقول وہ کھلی اور سنگی تدارکت تھے۔ مگر سید صاحب کی مصلحت اندیشی آڑے آتی تھی۔ یا ایول کہیں کہیں سید صاحب کی فوج میں ہر قسم کے لوگ تھے جسکی وجہ سے مولوی اسماعیل کھلم کھلا اپنے عزائم کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتے تھے جیسا کہ طفیل منگوری لکھتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ وہ جماعت مختلف اور متضاد گروہوں سے مرکب تھی جنھیں متحد رکھنے میں وہ مدت العمر مساعی ہے ان میں سے ایک گروہ کے سرور مولوی عبدالحمید اور مولوی کریم علی جو پوری تھے جو اہلسنت کا طریقہ رکھتے تھے اور دوسرے گروہ کے سرور مولوی اسماعیل تھے جو چاروں اماموں کی تقلید سے آزاد تھے اور براہِ راست حدیث کو اپنا ماخذ قرار دیتے تھے خود سید صاحب عمل کے اعتبار سے حنفی تھے مگر ساتھ مولوی اسماعیل کی جماعت کی سرپرستی کرتے تھے جو اپنے کو محمدی کہتے تھے۔

(مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۱۲۸)

مولوی اسماعیل دہلوی کے خوفناک عزائم کا پتہ اس خط سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے جو انھوں نے جمادی الاول ۱۲۳۶ھ میں سید صاحب کو ایک نقیشت کے سلسلے میں لکھا تھا۔ یہاں مکتوبات سید احمد شہید

سے انکے ترجمے کا اقتباس درج کیا جاتا ہے جو سخاوت مرزا نے کیا ہے۔

میں نے ایک پرچہ مکہ خدمت عالی میں ارسال کر دیا ہے جو انہوں نے چاہا تو جناب کے ملاحظہ سے گذرے گا لیکن اس موقع پر ذرا تامل سے کام لینا چاہیے کیونکہ یہاں دو معاملے درپیش ہیں۔ ایک تو مفسدوں اور مخالفوں کے ارتداد کا ثابت کرنا اور قتل و خون کے جواز کی صورت نکالنا اور انکے موال کے جواز پر قرار دینا۔ اس بات سے قطع نظر کہ وہ انکے ارتداد پر یا انکی بغاوت پر مبنی ہے دوسرے یہ کہ اسکا آیا کوئی سبب ہے۔ یا کچھ اور ہے۔ جبکہ بعض اشخاص کے مقابلہ میں انکا مرتد ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ اور بعض کے متعلق بغاوت یا اسکا کوئی اور سبب اگرچہ کہ مبیلا طریقہ ہمارے پاس وہی یعنی تحقیق و تفتیش کرنا ہے۔ کیونکہ ہم ان فتنہ پرانوں کوئی الحقیقت مرتدوں بلکہ اصل کافروں میں شمار کرتے ہیں اور انکو اہل کتاب کافروں کے مثل جانتے ہیں۔

مکتوبات سید احمد شہید ص ۲۴۲

عبارت کی پیچیدگی کے باوجود یہ بات واضح طریقہ سے سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے کفر و ارتداد میں شک و شبہ نہیں۔ اور قتل و خون ریزی کے جواز میں کوئی تامل نہیں۔ تامل صرف اس بات میں ہے کہ ان اسباب کو تلاش کیا جائے جنکی وجہ سے انکے اندر متابعت سے اعراض کی جرأت پیدا ہوئی ورنہ ان کا ارتداد اور انکا کفر ہونا ثابت ہے انکو قتل کیا جاسکتا ہے اور انکے مال و متاع کو لوٹنا درست ہے۔

اب وہ آسمان زنی کا معاملہ تو اس کا واقعہ یہ ہے کہ پشاور کے سرداروں کے ممالک میں اس میں کوئی شک نہیں کہ طرح طرح کا ظلم، فسق و فجور اور جاہلیت کی رسیں لڑجھکیں جو اب تک موجود ہیں اور ایسی ہر مملکت میں جہاں ایسی فتنہ پردازیاں ہوں تو اس ملک پر شک و گمان نہ کرنا امام کیلئے جائز ہے اور اس سلطنت کو درہم برہم کر دینا ثواب کا کام ہے۔

مکتوبات سید احمد شہید ص ۲۴۲

مولوی اسماعیل صاحب کا رویہ ابتدا ہی سے انتہائی جارحانہ رہا ہے اور اس کی دلیل خود ان کی کتاب تقویۃ الایمان ہے جس میں دینا کے کسی فرد کو صاحب ایمان نہیں ہونے دیا گیا ہے (تفصیل آرہی ہے)

وہابیوں کی کہانی کنہیا لعل کی زبانی | سچ یہ ہے کہ اس دور میں جسے جدید مورخین دور اول کا نام دیتے ہیں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جس سے معلوم ہو کہ سید صاحب اور مولوی اسماعیل صاحب نے انگریزوں سے جنگ کی ہو۔ اس باب میں کنہیا لعل کی بات قدرے واضح ہے۔

تاریخ پنجاب مصنفہ کنہیا لعل ص ۱۸۸ وہ اپنی اس کتاب میں واقعات جہاد میان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

سید صاحب نے اپنا درپوش کی سردار محمد خان نے بجات نہ چاری اسکی اطاعت قبول کی اور اس نے اپنا عمل دخل پشاد میں کر کے سردار سلطان محمد خان کو اپنی نجات پر مقرر کیا اور قاضی مفتی وہابی مذہب کے شہر میں مامور کر دیئے یہ سید احمد مراد فرقد وہابیہ کا تھا اور اس سے اول یہ ہندوستان سے بالفاق مولوی محمد اسماعیل کے عرب کو گیا اور علاقہ نجد میں رہ کر وہابیہ مذہب کی تعلیم پائی۔ پھر یہ ہندوستان میں آیا اور چاہا کہ بوسید تب د کے مجمع جمع کر کے کسی علاقہ کی ریاست حاصل کرے اس ارادے پر اس نے بہت روپیہ جمع کیا اور قریب چار ہزار جہادی لوگ مجتمع کر کے پہاڑ پہاڑ جو کہ پشاور کے علاقہ میں سر آٹھا۔ بظاہر اس کا اہتمام تھا کہ میں کنارے جنگ کر کے مسلمان دین کو پھیلایا جاسکتا ہوں چنانچہ اس نے پشاور فتح کر کے بہت جمعیت اپنے ساتھ کر لی علاقہ یوسف زئی کے پٹھان ہی اسکے ساتھ بے شمار شامل ہو گئے تھے۔

(تاریخ پنجاب ص ۲۱۳)

اسی واقعہ کو بطور وضاحت سردار سلطان خان محمد کی زبانی بھی سن لیں۔

پہلے یہ شخص کلکتہ کو گیا اور وہاں سے جہاز میں بیٹھ کر خانہ کعبہ کو گیا اور وہاں نجد کے وہابی علماء بہت آئے ہوئے تھے ان سے اس کی ملاقات ہوئی اور وہ یہاں تک اس پر غالب آئے کہ اپنے مذہب میں اسکو ملایا۔ اور اس نے بھی اپنے تمام ہمراہوں کو اس مذہب کی پابندی میں داخل کر لیا۔ اور وہاں سے پکا وہابی ہو کر پھر ہندوستان میں آیا۔ اور وہاں کہ میں جہاد کرنے پر مستعد ہوں ہر ایک علماء کو چاہئے کہ مال و جان سے میری امداد

کرے۔ ہر ایک مسلمان رئیس کے پاس یہ خود گیا اور ذکرِ تشریح بہانہ جہاد وصول کیا۔ بہت سے مسلمان جان دینے کیلئے اس کے ساتھ ہو گئے۔

چونکہ اصل مقصد اسکا یہ تھا کہ کسی بے انتظام علاقہ میں جاکر ریاست حاصل کرے اور وائی ملک بنجائے اس واسطے یہ گوشہ اُس نے اپنی خواہش کے مطابق پایا اور پہاڑ کے راستہ پشاور کے علاقہ میں آپہنچا۔

(تاریخ پنجاب ص ۳۲۴)

اس کے بعد سکھوں کی فوج پشاور پہنچی تو یہ پشاور خالی کر کے پہاڑوں پر چڑھ گئے، عرصہ تک سکھوں کی فوج پشاور میں رہی مگر سید صاحب اور ان کے غازی بلند و بالا پہاڑوں سے نیچے نہیں اترے اور جب سکھوں کی فوج واپس ہو گئی تو۔

سید احمد جہادی نے پھر پشاور کا میدان خالی پایا یاںی الفوریوسف زلیں کے علاقہ سے نکل کر پشاور پرورش کی سلطان محمد کے پاس اپنی ذاتی فوج بہت کم تھی اس نے اطاعت مان لی تو سید احمد اپنی مراد کو پہنچ گیا تمام علاقہ میں اپنے کارواں پہنچا دئے۔ سردار سلطان محمد خاں کو اپنی نیابت عطا کی اور خوجا انتظام عرصہ دو ماہ کر کے بارادہ فراہمی فوج یوسف زلیوں کی طرف چلا۔ مگر وہاں جا کر اس کی تدبیر مخالفت پڑی کہ اس نے بیباک ہو کر مختلف مذاہب اہلسنت و جماعت تمام لوگوں کو اپنے ولایتیہ مذاہب میں داخل کرنا چاہا اور ہر ممبر پر بیٹھ کر وعظ کیا کہ کوئی مسلمان کسی مقبرہ پر نہ جائے اسکو میلہ پڑ کر دمانے مانگے اور اپنے بڑے بزرگوں کی ارجح کو کچھ نہ دیوے۔ انکو ہرگز نہیں پہنچتا۔

یہ مسائل جب اپنے مذاہب کے برخلاف لوگوں نے سنے تو حیران رہ گئے اور ملاؤں سے حال دریافت کیا چونکہ ملاں لوگوں کا اس میں کمال نقصان تھا انہوں نے مل کر تمام علاقہ یوسف زلیوں کا دشمن بنادیا۔

علاوہ اسکے مشائخ، بزرگ، عابد و خدا پرست لوگ اس علاقہ کے سید احمد کے ایجابی دشمن بنے کہ اسکے حق میں کفر کا فتویٰ دیا اور کہا کہ یہ سید احمد وہابی اولیا کی کرامت کا منکر ہے آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ یوسف زلیوں نے اس کو بروز شمشیر اپنے علاقہ سے نکال دیا

اور اسکی صورت سے سبزار ہو گئے۔ جب یہ حال پشاور میں مشہور ہوا تو شہر والوں نے ہجوم کر کے اس کے اہکار شہر سے باہر کر دئے۔

تاریخ پنجاب ص ۳۲۸

گوروں کی سرپرستی

مذکورہ بالا احوال و واقعات سے جہاں بنیادی نقطہ نظر کے اختلاف کا اظہار ہوتا ہے وہیں جناب سید احمد بریلوی اور ان کے

رفقاء کے عزم کا بھی پتہ چلتا ہے۔ جانبدار مصنفین کی ہزاروں پردہ پوشیوں کے باوجود یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ ان حضرات کا اصل مقصد و مدعا وہابیت کا فروغ اور وہابی حکومت کا قیام تھا جسے نئے موزین، "حکومت الہیہ" کے خوبصورت نام سے یاد کرتے ہیں۔

ہمارے نزدیک انکا انگریزوں سے جہاد خارج از بحث ہے انگریز اتنے بیوقوف کبھی بھی نہیں تھے کہ ان حضرات کو منظم اور مسلح کر کے کہتے "آبل مجھے مار" بلکہ انگریزوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کیلئے انھیں استعمال کیا اور یہ حضرات استعمال ہو گئے بالکل اسی طرح جیسے ہندوؤں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کیلئے انھیں استعمال کیا اور یہ استعمال ہو گئے بلکہ ہوئے ہیں جیسا کہ طفیل احمد منگلوری اپنی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" میں تحریر فرماتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ گورنمنٹ انگریزی نے اسوقت یہ کیوں گوارا کیا کہ تمام ہندوستان میں جہاد کیلئے سامان جنگ اور روپیہ فراہم ہوتا ہے۔ اور گورنمنٹ کی طرف سے نہ صرف اسکی اجازت ہو بلکہ مجاہدین کو ہر قسم کی امداد دی جائے اور انکار روپیہ وصول کر کے انھیں دیا جائے اسکا جواب حسب ذیل اقتباس میں ملے گا۔

اس میں شک نہیں کہ اگر سرکار اسوقت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ہوتی تو ہندوستان سے سید صاحب کو کچھ بھی مدد نہ پہنچی۔ مگر سرکار انگریزوں اسوقت دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو۔

(مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۱۳۴)

اور فرمائیے کہ اس عبارت سے کیا کیا نتیجہ اخذ کئے جاسکتے ہیں؟ اور تقریباً یہی بات جناب مولوی محمد جعفر تھانیسری بھی لکھتے ہیں۔

اس سوانح اور مکتوبات کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحب کا انگریزی سرکار سے جہاد کر نیکا ہرگز ارادہ نہ تھا۔ وہ اس آزاد عملداری کو اپنی ہی عملداری سمجھتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ انگریزی سرکار اس وقت سید صاحب کے خلاف ہوتی تو ہندوستان سے سید صاحب کو کچھ بھی مدد نہ پہنچتی۔ مگر سرکار انگریزی اس وقت دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو۔

(جہاد سید احمد شہید ص ۲۹۳ جعفر تھانیسری)

چنانچہ جو اعلامیہ سید صاحب کی طرف سے بطور امیر المؤمنین کے جاری ہوا اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ جنگ انگریزوں سے نہیں سکھوں سے تھی۔

نہ تو ہم کو مسلمان امرا میں سے کسی کے ساتھ تنازعہ ہے اور نہ کسی مسلمان رئیس سے مخالفت ہے ہمارا مقابلہ کنار لیسزوں سے ہے نہ مدعیان اسلام سے۔ بلکہ صرف لٹے بولے والے سکھوں سے ہماری جنگ ہے کلمہ گوئیوں اور اسلام کے طالبوں سے ہیں اور نہ سرکار انگریزی سے ہم کو کوئی مخالفت ہے اور نہ کوئی جھگڑا ہے کیونکہ ہم تو اسکی رعایا ہیں۔ بلکہ ہم کو اس کی حمایت میں رعایا کے مظالم کا استیصال کرنا ہے (مکتوبات سید احمد شہید مترجم سخاوت مرزا ص ۲۲)

اور جناب طفیل احمد منگلوری سوانح احمدی کے حوالے سے لکھتے ہیں

اور سرکار انگریزی کو منکر اسلام ہے مگر مسلمانوں پر ظلم و تعدی نہیں کرتی اور نہ انکو فرض مذہبی اور عبادت لازمی سے روکتی ہے پھر ہم سرکار انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں اور خلاف اصول مذہب طرفین کا خون بلا سبب گرا دیں۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۱۲۲

یوں تو انگریزوں کی سرپرستی کی داستان بہت طویل ہے۔ اس جہاد میں قدم قدم پر انگریزوں نے سید صاحب اور ان کے مجاہدین سے بھرپور تعاون کیا ہے۔ جیسا کہ یہی منگلوری صاحب سرسید کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

اس زمانہ میں علی العموم مسلمان لوگ عوام کو سکھوں پر جہاد کرنیکی ہدایت کرتے تھے

نہ اردوں مسلح مسلمان اور بے شمار سامان جنگ کا ذخیرہ سکھوں پر جہاد کرنیکے واسطے جمع ہو گیا مگر جب صاحب کمشنر اور صاحب مجسٹریٹ کو اسکی اطلاع ہوئی تو انھوں نے گورنمنٹ کو اطلاع دی گورنمنٹ نے صاف لکھا کہ تم کو درست اندازی نہیں کرنی چاہئے دہلی کے ایک مجاہد نے جہادیوں کا روپیہ چھین لیا تو ولیم فریزر کمشنر دہلی نے ڈگری دی جو وصول ہو کر سرحد بھیجی گئی۔

(حوالہ مذکور ص ۱۳۲)

ان مندرجات کی روشنی میں کوئی شخص اس کے علاوہ کیا سوچ سکتا ہے کہ ان مجاہدین کا فرنگیوں سے گہرا رابطہ تھا یہی وجہ ہے کہ "جہاد پر جانے سے قبل سید صاحب نے شیخ غلام علی رئیس الدہ آباد کی معرفت نواب لفٹیننٹ گورنر کو ارادہ جہاد کی اطلاع دی جواب ملا کہ جب تک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو ہم ایسی تیاری کے مانع نہیں"

اور تقریباً یہی بات مولانا حسین احمد صاحب مدنی بھی فرماتے ہیں اور انکی تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں نے سید صاحب کیساتھ بھرپور تعاون کیا تھا لفتش حیات میں لکھتے ہیں کہ "جب سید صاحب کا ارادہ سکھوں سے جنگ کر نیکا ہوا تو انگریزوں نے اطمینان کا سانس لیا اور جنگی ضرورتوں کا سامان مہیا کرنے میں سید صاحب کی مدد کی"

یہی نہیں بلکہ سید صاحب کے تعلقات انگریزوں سے اتنے گہرے تھے کہ عین زمانہ جنگ میں جب راجہ رنجیت سنگھ نے حکیم عزیز الدین اور سردار وزیر سنگھ کو سفیر مقرر کیا۔

اور پیام صلح دیکر سید صاحب کی طرف بھیجا صلح کی شرط راجہ رنجیت سنگھ نے یہ پیش کی کہ دریائے اباسین سے بائیں طرف کا ملک جو سید صاحب کے قبضے میں ہے اُنکے قبضے میں ہے اور وہ دائیں طرف کا قصد نہ کریں راجہ رنجیت سنگھ کی اس سفارت کا جواب سید صاحب نے مولوی خیر الدین شیر کوٹی اور حاجی بہادر خاں کے ہاتھ بھیجا وہ سب سے پہلے جنرل وٹوار کی ملاقات کو گئے۔

جنرل وٹوار نے ڈپلویس کا جال پھیلایا اور کہا کہ جس وقت میرا ڈیرا حضور میں تھا اس وقت ایک شخص بطور سفیر خلیفہ صاحب (یعنی حضرت مولانا سید احمد بریلوی) کی طرف میرے

پاس آیا تھا اور کہا تھا کہ اگر راجا رنجیت سنگھ خلیفہ صاحب کی معرفت (مالگنداری) ملک یوسف زئی کی کیا کریں تو سرکار خالصہ تکلیف فوج کشی اور زیربانی سے ہائی پائے اور اس ملک کے آدمی تاجی اور آتش زنی سے مخلصی پائیں سو یہ بات جھکو بہت پسند آئی۔

جنرل دتھورا کی چال بہت گہری تھی اسکی کوشش تھی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے (موج کوثر ص ۲۸۵ شیخ محمد اکرام)

اسکے بعد جنرل دتھورا اور سید صاحب کے سفروں کے درمیان کچھ تلخ باتیں ہوئیں اور یہ سفارت رنجیت سنگھ کے پاس جانے کے بجائے دتھور سے ملاقات کر کے واپس آگئی (موج کوثر) اگر یہاں کہا جائے کہ بات اعتماد کی ہے تو کچھ غلط ہوگا یعنی پیش کش راجہ رنجیت سنگھ کی تھی اور پہل بھی راجہ کی طرف سے ہوئی مگر سید صاحب کے سفیر پہلے جنرل دتھور سے ملتے ہیں تاکہ ضروری مشورہ فرما سکیں اور بعد یہ کہ راجہ رنجیت سنگھ سے گفتگو کے بغیر واپس ہو جاتے ہیں جو سراسر خلاف اصول ہے بہر صورت دتھورا کی چال کامیاب رہی یعنی بڑا ڈاؤ اور مجاہدین اس چال کا شکار ہو گئے۔

حیرت یہ ہے کہ مولانا مدنی اور انکے ہم خیال کا نگریسی ذہن رکھنے والے حضرات انگریزوں سے جہاد ثابت کرنے کے درپے ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجاہدین اور انکے قائدین کا واضح عقیدہ اور نظریہ یہ تھا کہ انگریزوں سے جہاد ناجائز و ناجائز ہے پھر تم کیسے تسلیم کر لیں کہ ان حضرات نے انگریزوں سے جہاد کیا ہوگا۔ ہم بالیقین کہہ سکتے ہیں کہ برصغیر میں سید صاحب کی تحریک جہاد کی بالکل وہی صورت تھی جو وہابیان نجد کی وجہ سے حجاز مقدس میں رونما ہوئی۔ وہاں بھی وہابیوں نے انگریزوں کی مدد اور تعاون سے اہل حجاز کا خون بہایا اور فتوؤں کی آڑ میں انکی عصمتوں کو حلال کیا۔ انکی بیہوشیاں کو باندھ دیا گیا اور ان کے اموال لوٹے اور انھیں گھر بار چھوڑنے پر مجبور کیا۔

اور یہاں بھی انگریزوں ہی کی مدد اور تعاون سے سنی حنفی مسلمانوں کو کافر، مشرک، مرتد، منافق اور مبتدع باغی قرار دے کر انکی بیہوشیوں کو باندھ دیا گیا۔ قتل و غارتگری لگی گئی، لوہے سے پتھروں کے سینے سیراب کر دئے گئے اور نکاح بیوگان کی آڑ میں پٹھانوں کے ناموس کی دھجیاں بکھیر دی گئیں۔

انگریز یا سنگھ

یہ عنوان جناب ایوب قادری صاحب کا نام کردہ ہے۔ موصوف دور جدید کے خاصے نامور مورخ شمار ہوتے ہیں۔ خصوصاً سید صاحب کی تحریک جہاد۔ اور برصغیر سے متعلق احوال و واقعات اور شخصیات پر کافی کچھ لکھا ہے انکے حوالے سے ہمارے نقطہ نظر کی بھرپور تائید ہوتی ہے کہ تحریک مجاہدین کا مقصد "وہابی اسٹیٹ" کا قیام تھا جناب قادری لکھتے ہیں۔

تحریک مجاہدین کے سلسلے میں ایک امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے بعض لوگوں نے یہ بحث چھیڑی ہے کہ تحریک مجاہدین کا مقصد سکھوں کا استیصال تھا یا انگریزوں کے اقتدار سے چھٹکارا حاصل کرنا

حقیقت یہ ہے کہ تحریک مجاہدین کا مقصد حکومت الہیہ کا قیام اور مسلمانوں کے گئے ہوئے اقتدار کو واپس لانا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کا مقصد مسلمانوں سے زیادہ تو انگریز مورخ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے سمجھا ہے اور انڈین مسلمانس میں واضح کر دیا ہے۔

(جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۶۸ ایوب قادری)

اور ہنٹر نے نہایت وضاحت کیساتھ لکھا ہے کہ یہ ایک وہابی تحریک تھی اور نجری تحریک ثابت کا پرہیزی۔ یہ لوگ سرحد میں وہی کچھ کرنا چاہتے تھے جو عرب میں نجدی وہابیوں نے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایوب قادری کے علاوہ تقریباً سبھی اہل قلم وہابیوں نے ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی سخت مخالفت کی ہے سرسید سے لیکر مہر صاحب تک جتنے بھی اس تبدیل کے مورخین گذرے ہیں کسی نے بھی ہنٹر کی تائید نہیں کی جبکہ ایوب قادری خود لکھتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ شوشہ بھی اپنوں ہی کی طرف سے حکومت برطانیہ کی وفاداری کے سلسلے میں چھوڑا گیا۔ سب سے پہلے سرسید احمد خاں نے (آورانڈین مسلمانس) پر تبصرہ کیا اور ثابت کر دیا کہ شوشہ کی یہ جہاد سکھوں کے خلاف تھا

(جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۶۹)

ایوب قادری صاحب کے مندرجات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ

- سید صاحب کا مقصد جہاد و دہائی حکومت کا قیام تھا جسے قادری صاحب حکومت الہیہ کہتے ہیں
- اور یہ کہ فی الواقع سید صاحب کی جنگ کسی سے نہیں تھی۔
- اور یہ کہ اس باب میں جو کچھ ہنر سے لکھا ہے درست لکھا ہے
- اور یہ کہ سید صاحب کا مقصد سکھوں سے جہاد کرنا نہیں تھا بلکہ انگریزوں سے تھا۔
- اور یہ کہ یہ سید صاحب کی اپنی من گھڑت ہے؟
- جناب ایوب قادری نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ

اس تحریک کے خاص رکن مولوی محمد جعفر تھانیسری نے اصل مواد میں ترمیم کر کے انگریزوں کے بجائے سکھوں کا لفظ لکھا اور مشہر کیا (جنگ آزادی ص ۶۹)۔

خدا راہیں بتایا جائے کہ محمد جعفر تھانیسری، مرزا حیرت دہلوی، سر سید احمد خاں اور انھیں جیسے بہت سے لوگ کون تھے اور کن لوگوں کے بزرگ تھے؟ اور یہ ترمیم، تحریف، تنسیخ کن لوگوں سے سرزد ہوئی۔ اور ایسا کیوں ہوا۔ تاریخ کیسا تھوڑا اندوہناک ظالمانہ مذاق کن لوگوں نے کیا؟ ہر قادری ان باتوں کا جواب طلب کرتا ہے۔

اور یہ کہ کیا قادری صاحب اپنے اس موقف کے ثبوت میں کہ ”سکھوں سے جنگ کا ثبوت اینوں ہی کی طرف سے حکومت برطانیہ کی وفاداری کے سلسلے میں پھوڑا گیا اور یہ کہ انگریزوں کے بجائے سکھوں کا لفظ لکھا اور مشہر کیا گیا“ کوئی ایسا صحیح نسخہ پیش کر سکتے ہیں جس میں سکھ کے بجائے انگریز لکھا ہوا ہو۔

پھر حیرت یہ ہے کہ مولانا مدنی اپنی خود نوشت نقش حیات میں جعفر تھانیسری کو مستند قرار دیتے ہیں۔

”مولوی محمد جعفر تھانیسری جو سید صاحب کے نہایت مستند سوانح نگار ہیں نقش حیات اور اسی طرح محمد اقبال سلیم کا ہندوی حیات سید احمد شہید کے ابتدائی میں لکھتے ہیں۔

یہ کتاب حیات سید احمد شہید مصنف مولانا محمد جعفر تھانیسری جو اس وقت نفیس کیڈی کی طرف سے شائع کیا جا رہی ہے حضرت سید احمد شہید کے مخلص متبع کی تصنیف ہے حیات سید احمد شہید۔

بہر صورت مجاہدین کا ارادہ سکھوں سے جنگ کا ہو یا انگریزوں سے دہائی کا خون سرحد کے سنی حنفی پٹھانوں ہی کا بہا گیا اور یہ سب اس منصوبہ بندی کے تحت ہوا کہ پہلے ان (مناقضین، مرتدین) پٹھانوں کو ختم کر دے پھر انگریزوں اور سکھوں سے نبٹے رہیں گے۔

چنانچہ جناب ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب ”سیرت سید احمد شہید“ میں مولوی محمد اسماعیل صاحب دہلوی کا ایک خط نقل کرتے ہیں جس کے پڑھنے کے بعد ان کے خونی عزائم کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں

اعترض کا جواب تلوار ہے

پھر جب آپ کی امامت ثابت ہوگی اور کوئی امر جو اس منصب سے آپ کی علیحدگی کا سبب ہو نہ پایا گیا پس آپ کی اطاعت تمام مسلمانوں پر واجب ہوگی جو آپ کی امامت سے تسلیم نہ کرے یا تسلیم کرنے سے انکار کرے وہ باغی متحمل الدم ہے اور اس کا قتل کفار کے قتل کی طرح عین جہاد اور اس کی بے عزتی تمام اہل فساد کی طرح خدا کی عین مرضی ہے۔ اسلئے کہ ایسے لوگ حکمِ حادیث متواترہ کلاب النار اور ملعونینِ اشرار میں اس مسئلہ میں اس ضعیف کا یہی مذہب ہے اور معترضین کے اعترض کا جواب تلوار ہے نہ کہ تحریر و تقریر (سیرت سید احمد شہید ص ۱۲۷ علی ندوی)۔

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام کہ ایک شخص ایک گروہ ایک جماعت کو لیکر پہاڑوں میں بنام جہاد جا بٹھرے اور کچھ لوگوں کو جمع کر کے امامت کا دعویٰ کر دے تو کیا وہ فوجی لیڈر امام المسلمین کہلا سکتا ہے۔ اور یہ کہ اُسکی اطاعت نہ کریں تو لے اسلام کے باغی قرار دے جائینگے اور اسکے زمانے والوں کا خون حلال ہوگا، انکے مال و منال لوٹ لے جائینگے۔ انکی عورتیں باندیاں بنالی جائینگیں؟ بینوا اور

شیخ اکرام کی گواہی

اور پھر واقعہ مولوی محمد اسماعیل اور انکے ساتھیوں کی تلواریں بے نیام ہو گئیں اور مسلمانوں کا خون کچھ اس طرح بہا گیا کہ دریائے اباسین کا پانی سرخ ہو گیا۔ اگر غور کیا جائے تو مولوی محمد اسماعیل کی زبان وہی ہے جو عرب کے نجدیوں کی تھی اور ان کا طرز عمل وہی ہے جو وہاں بیان نہ کیا تھا۔

کیا انھوں نے سرحد میں وہی کچھ نہیں کیا جو نجدیوں کے ہاتھوں حجاز مقدس میں ہو چکا تھا۔ شیخ اکرام لکھتے ہیں۔

اسکے علاوہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سید صاحب کے بعض سامعیوں کا رویہ ہمدردی اور معاملہ فہمی کا تھا بلکہ وہ جلد ہی فاتحانہ تشدد پر اتر آئے مثلاً خان اللہ بخش ہی سید صاحب کے مقرر کردہ ایک قاضی کی نسبت لکھتے ہیں۔

ایک موقع پر جب مذکورہ جماعت (مجاہدین) کے قائد سید محمد جہاں کے ارشاد پر کہ جو اہل رسوم خدا و رسول کے حکم کے خلاف باپ دادا کی ریت پر چلتے ہیں وہ عملاً کافر ہیں۔ کسی نے کہہ دیا کہ منینۃ المصلیٰ میں اہل رسوم کو کافر نہیں کہا گیا تو اس کا جواب گھونسو سے دیا گیا۔ اور قائد موصوف نے اس وقت تک معترض کو نہیں چھوڑا جب تک اس نے دوبارہ کلمہ نہیں پڑھ لیا۔ بالفاظ واضح تر اسے دوبارہ مسلمان بنایا گیا۔

موج کو ترغیب ۳۱ شرح محمد اکرام

ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں جناب علی ندوی مجاہدین کے قتل کے اسباب محرکات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

مذکورہ بالا اسباب میں اتنا اور اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ سمد کے علاقہ میں جو غازی متعین یا مقیم تھے۔ یا کبھی کبھی کسی ضرورت سے دورہ کرتے تھے ان میں سے جنکو زیادہ صحبت و تربیت میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا یا مزاجاً درشت اور لاابالی واقع ہوئے تھے ان سے کہیں کہیں بدعنوانیوں اور تعدی کے واقعات بھی پیش آئے

سیرت سید احمد شہید ج ۲ ص ۲۲۲

اگرچہ ان وحشت خیز واقعات کے ذکر میں جناب علی ندوی کا لہجہ دھیما اور دبا دبا سا ہے مگر بات وہی ہے جو شیخ اکرام کی تحریر سے منظر ہے۔ اور یہ تمام کاروائیاں ان فتاوؤں کے زیر اثر عمل میں لائی جاتی تھیں جو امیر المؤمنین کی طرف جاری کئے جاتے تھے اور یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ اس قسم کے فتاوے مولوی محمد اسماعیل ہی تصنیف فرماتے تھے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

سید صاحب کی امامت از روئے قوانین شرعیہ تعامل ثابت و برحق ہے آپ کی اعلیٰ فہم اور اس سے خارج باتفاق کتاب و سنت و اجماع و نصوص فقہ باغی کا قتل واجب اسکا خون حلال اور وہ نازی ہے اس پر نماز جنازہ بھی نہیں پڑھنی چاہئے (سیرت سید احمد شہید ج ۲ ص ۲۲۲)

اسے کہتے ہیں »ذئاب فی ثیاب« دوسروں پر شر انگیزی۔ فتنہ سازش۔ فتویٰ بازی کا الزام لگانے والوں کو چاہئے کہ اس آئینہ کو سامنے رکھیں تاکہ انھیں اپنی تصویر نظر آتی ہے۔ اور مطلوبہ میرٹ کا بادلہ اوڑھ کر دوسروں کو ظالم قرار دینے والوں کو اب سوچنا چاہئے کہ تاویر یہ تقدس مآبی باقی نہیں رہ سکتی۔

حیرت انگیز انکشاف مرزا حیرت دہلوی نے اپنی کتاب »حیات طیبہ« میں جہاں علمائے کرام اور مشائخ عظام پر نہایت گھناؤنے اور دلیک حملے کئے ہیں وہیں جھونک میں کچھ ایسی باتیں بھی لکھ گئے ہیں جن سے ہمارے موقف کی تائید ہوتی ہے جناب حیرت لکھتے ہیں۔

فتح پشاور کے بعد اکرام شرع ناگوار صورت میں پبلک کے سامنے پیش کئے جاتے تھے صد ہا غازیوں کو مختلف ہمدول پر مقرر فرمایا تھا کہ وہ شرع محمدی کے موافق عمل درآمد کریں۔ مگر انکی بے اعتدالیوں حد سے بڑھ گئی تھیں وہ بعض اوقات نوجوان خواتین کو مجبور کرتے تھے کہ ان سے نکاح کریں اور بعض اوقات یہ دیکھا گیا کہ عام طور پر دو تین دو شہیزہ لڑکیاں جاری ہیں مجاہدین میں سے کسی انھیں پکڑا اور زبردستی مسجدیں لہجہ کر نکاح پڑھوایا

حیات طیبہ جز اول ص ۲۲

الحاصل ہم »دہشتی کے دانت« نامی کتاب میں جناب سید احمد بریلوی اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے جہاد اور اسکے اسباب و بواعث، پٹھانوں کی فداکاری اور ان پر فتاوؤں کی بمباری، مجاہدین کی بے اعتدالیاں۔ اور اس تحریک جہاد کے ناکامی کے اسباب، دہلوی عقائد و نظریات اور پھر اس باب میں مورخین کا اضطراب ناقابل تردید حقائق کی روشنی میں بیان کر چکے ہیں۔

تقویۃ الایمان

عقائد و نظریات کی اہمیت اس سے پہلے کہ ہم تقویۃ الایمان (مسنف مولوی محمد اسماعیل دہلوی) اور جناب ایوب قادری کے درباروں اور تحریک جہاد کے متعلق مزید خیالات کا اظہار کریں باختلافات کے بنیادی وجہ کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں

دورِ حاضر کی تعنیفات و تالیفات کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ اس دور کے اہل قلم حضرات عقائد و نظریات کے اختلافات کو عمدہ کوئی وقعت نہیں دینے، حالانکہ قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ میں عقائد و نظریات کو بہت بڑا دخل ہے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ عقائد و نظریات کی بنیاد پر ملک کے ملک زیر و زبر ہو گئے۔ بہتے ہوئے لہو کی حرارت سے زمین کا شاداب سپینہ جھلس کر رہ گیا ہے۔ ایک ہی ملک ایک ہی قبیلہ ایک ہی خاندان کے لوگوں نے صرف نظریاتی اختلاف کی بنیاد پر ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ ڈالی ہیں۔

آپ اس دور کی تصنیفات ہی کو دیکھ لیجئے کہ تذکرہ نویس حضرت پر کس قدر انا نیت اور نظریاتی تعصب کا غلبہ ہے کہ صرف نظریاتی اختلاف کی بنا پر کیے کیے عظیم لوگوں کو تباہ کیوں کے حوالے کر دیا گیا ہے میں یہ کہنے میں قطعاً باک نہیں محسوس کرتا کہ عقائد و نظریات ہی کے اختلاف کی وجہ سے سید احمد بریلوی اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے پٹھانوں کو شرک، منافق، باغی قرار دے کر قہرِ مہم کا جو دم روا رکھا اور عقائد و نظریات ہی کے اختلاف کی وجہ سے پٹھانوں نے جناب سید احمد بریلوی اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کو تہ تیغ کر دیا۔

اختلاف کا پہلا بیج

اختلاف کا پہلا بیج | یہ بات علی روس الاشداد کہی جاسکتی ہے کہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی تقویۃ الایمان کے وجود میں آنے سے پہلے برصغیر کے علماء میں کوئی قابل ذکر اختلاف نہیں تھا۔ اور اگر تھا تو کم از کم تاریخ اس کو کوئی وقعت نہیں دیتی۔ مگر پھر اچانک ہی اتفاق و اتحاد کی پوری فضا دھندلا کر رہ گئی۔ اور مولوی محمد اسماعیل کی تقویۃ الایمان کو افتراق بین المسلمین کا شرف حاصل ہو گیا۔

اور میں علی رؤس الاسہاد کہہ سکتا ہوں کہ یہی انگریزوں کا مقصد تھا جو "تقویتہ الایمان" کے ذریعہ پورا ہو گیا۔ جناب "روشن مستقبل کے مصنف" طفیل احمد منگلوری فرماتے ہیں۔

مہندو مسلمان کے مابین عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی۔ اُسکے بعد جو طریقہ اختیار کیا گیا اُسکا حال ”سرجان میسکم“ کے قول سے معلوم ہوگا۔ وہ یہ ہے اس قدر وسیع سلطنت میں ہماری غیر معمولی قسم کی حکومت کی حفاظت اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری عملداری میں جو بڑی جماعتیں انکی عام تقسیم ہو۔ اور پھر ہر ایک جماعت

کے ٹکڑے مختلف ذاتوں اور فرقوں اور قوموں میں ہوں۔ جب تک یہ لوگ اس طریقے سے جدا رہیں گے، اُس وقت تک غالباً کوئی بغاوت اٹھ کر ہماری قوم کے استحکام کو متزلزل نہ کرے گی۔

۱۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۲۴۴

جناب منگھوری کے اس ارشاد کے پیش نظر ہمارے عہد پر یہ صحیح ہے کہ ”ہندوستان میں“ کم از کم مسلمانوں کے درمیان افتراق کی یہ فضا نہیں تھی۔ اور یہ فضا انگریزوں نے اپنی مقصد پر آری کیلئے پیدا کی۔ تو اب ہمیں انصاف کی نظر سے یہ دیکھنا پڑے گا کہ اختلاف و انتشار کا خرج کہاں ہے۔ اور وہ خرج ”تقویت الایمان“ ہے جس کے ذریعہ تمام مسلمانوں کو کافر بنا کر قتل کا سہج بویا لگے۔

چنانچہ جناب ایوب قادری جو مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور ان کے مخدوم سید احمد بریلوی کے نہایت جوش حمایتی اور مداح ہیں اپنی کتاب جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں لکھتے ہیں۔

تحتلک مجاہدین پر ایک نظر! دور اول سید احمد کی تحریک تجدید و احیائے
دین اور جہاد کی تحریک حقّی توحید خالص کی تبلیغ شرک و بدعت اور تہرہ پرستی کا استیصال
مراجم محرم کی بیچ کنی شادی و غمی نیز دیگر تقریبات کے غیر اسلامی مراسم کے بجائے اسلامی
سادہ زندگی کا اہیار۔ اور نکاح بیوگان کی ترویج و اشاعت اسی تحریک کے
خاص عنصر تھے۔ اس مقصد کیلئے شاہ اسماعیل شہید نے تقویۃ الایمان جیسی انقلاب
آفرین کتاب لکھی۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ۵۴

مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی تقویت الایمان کے بابے میں ایک اور انقلاب آفرین خیال
ملاحظہ فرمائیے۔ مولوی محمد عارف سنبھلی جو زندہ العلماء کے استاد ہیں لکھتے ہیں۔

د اسی مجاہدانہ جذبہ سے سرشار ہو کر اصفیٰ نے تقویۃ الایمان لکھی اور شیطان اور اس کے چیلوں ✓
چیلوں نے امت محمدیہ کے جاہل طبقوں میں جو شرک پھیلا دیا تھا اس پر ٹھیک فائدہ دتی
انداز میں بھرپور وار کیا اور حتیٰ یہ ہے کہ اسکو جہنم رسید کر دیا۔
(بریلوی فتنہ کا تاروں ص ۴۴)

اور اب جناب ایوب قادری ہی کے قلم سے اس کتاب کا حاشیہ بھی ملاحظہ فرمائیں تاکہ بات واضح ہو جائے۔ لکھتے ہیں۔

مولانا فضل حق نے سب سے پہلے "تقویۃ الایمان" اس شہنشاہ کی توجہ شان.... کی بلبر کے پیدا کر ڈالے پر امتناع نظیر اور امکان نظیر کی بحث پھیری ایک مختصر سارسانہ اس عبارت کی رد میں لکھا پھر تو اس سلسلے میں بہت سے رسالے قلمبند ہوئے اور تقویۃ الایمان کے مستقل رد لکھے گئے۔

غرض اس تحریک کی مخالفت کے آثار کا سہرا مولانا فضل حق خیر آبادی کے سر ہے (حاشیہ ۵۴ ص ۵۴ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء)

جناب قادری اس بات پر تو برہم ہیں کہ مولانا فضل حق نے "تقویۃ الایمان" کا رد لکھا مگر تقویۃ الایمان جیسی گمراہ کن کتاب کو اس کی تمام حشر ثانیوں سمیت مہضم کر گئے۔

خود قادری صاحب کا یہ حال ہے کہ اپنے مدوح مولوی محمد اسماعیل صاحب دہلوی کی اس انقلاب آفرین کتاب کا بعینہ حوالہ بھی درج فرمایا کی جرأت نہ کر سکے۔

تقویۃ الایمان واقعی انقلاب آفرین کتاب ہے جس نے برصغیر کی ہستی سکرانی محبت و مروت سے بریز سر زمین پر نفرت و عداوت کے شعلے بھڑکا دیئے اس انقلاب آفرین کتاب کی بابت تو ہم کبھی کسی موقر پر گفتگو کریں گے۔ پہلے آپ مکمل حوالہ ملاحظہ فرمائیں جسے قادری صاحب نے نہ جانے کن مصممتوں کی بنا پر نظر انداز کر دیا ہے۔

جو کوئی کسی نبی ولی کو، امام شہید کو یا کسی فرشتہ کو یا کسی پیر کو اللہ کی جناب میں اس قسم کا شفیق سمجھے تو وہ اصلی مشرک ہے اور بڑا جاہل کہ اس نے خدا کے معنی کچھ بھی نہ سمجھے اور اس مالک کی قدر کچھ بھی نہ پہچانی۔ اس شہنشاہ کی شان تو یہ ہے کہ ایک آن میں ایک حکم کن سے چاہے تو کروڑوں نبی، جن فرشتے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر پیدا کر ڈالے۔

(تقویۃ الایمان راستہ کمپنی دیوبند ص ۲۲)

پوری تقویۃ الایمان گستاخیوں، بیباکیوں کا کھوٹا ہوا سمندر ہے جس نے نہ جانے کتنے

آباد دلوں کو ویران کر دیا ہے حتیٰ یہ ہے کہ جسے قادری صاحب انقلاب آفرین کتاب فرماتے ہیں وہ اس قابل ہے کہ نذر آتش کر دیا جائے۔ یاد ہے کہ مولوی محمد اسماعیل کی اس کتاب پر گرفت ہی نے مولانا فضل حق خیر آبادی علیہ الرحمہ کو ان کا معتب کیا ہے اگر حضرت خیر آبادی گرفت نہ فرماتے تو سب کچھ ٹھیک تھا۔

اسکے باوجود اس باب میں جناب ایوب قادری ستائش کے لائق ہیں کہ انہوں نے اختلاف کے بنیادی نقطہ نظر کا ذکر کیا اور اس کا بھی اقرار ہے کہ تقویۃ الایمان کے بعد ہی نظریاتی معرکہ آرائی شروع ہوئی۔ اور یہ کہ تقویۃ الایمان ہی اختلاف کی وجہ بنی ہے۔

اور یہ اختلافات اس وقت بہت واضح ہو گئے تھے جب سید احمد بریلوی اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے سرحد میں کیلگوٹہ برتری حاصل کر لی تھی۔ اور یہی اختلاف پہاڑوں میں ان کی مکمل تباہی کے اسباب بنے۔

بنیادی نقطہ نظر کا اختلاف | اس سلسلے میں جناب شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں۔

سید صاحب اپنے رفقاء کی بے اعتدالیوں کو روکنے کی مسلسل کوشش کرتے رہے اور جانتے تھے کہ سمجھدار اور حاملہ فہم حضرات کو ذمہ داریاں سونپنی چاہیں۔ مثلاً انہوں نے بڑی کوشش کی کہ مولانا فیصل الدین قاضی القضاہ بننے پر آمادہ ہو جائیں عشر کا بھی شاید کوئی حل نکل آتا۔ لیکن مجاہدین اور باقی باشندوں میں تو بنیادی نقطہ نظر کا اختلاف تھا۔ قبائل کو جو یہیں عزیز تھے مجاہدین کے نزدیک وہ کفر تھے حالات کو دیکھ کر وہ یہی فیصلہ کر سکے کہ مروجہ رسومات خلاف شریعت اسلامیہ تھیں اسوجہ سے پہلے انکی اصلاح ہونی چاہئے اور اسکے لئے اقدام شروع کر دیا۔ اور قرن اول کے مخلص مسلمانوں کی طرح بیک جنبش لب احکام خداوندی کو نافذ کرنا چاہا اور اس کا مطلق خیال نہ کیا کہ وہ قوم قرن اول کی قوم نہ تھی

موج کوثر ص ۲۱ شیخ محمد اکرام

اس سلسلے اگرچہ جناب شیخ اکرام چپا چاکر بات کرنے کے عادی ہیں اور مدح سرائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے پھر بھی حقیقت کا اظہار بہر صورت ہو گیا ہے مثلاً یہ کہ

”مجاہدین اور باقی باشندوں میں تو بنیادی نقطہ نظر کا اختلاف تھا، اگر فتنہ بے دل سے تجزیہ کیا جائے تو معاملات کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی یہ بات نہایت آسانی سے ثابت ہو سکتی ہے کہ اتنا خون خرابا نہ تو غلط رسموں کی بنیاد پر ہوا نہ ہی عشر کیوجہ سے ہوا اصل سبب بنیادی نقطہ نظر کا اختلاف تھا۔ حیرت ہے کہ سید صاحب کے قدیم و جدید مورخین بار بار یہی کہتے اور لکھتے ہیں کہ رسموں کی بنا پر جنگ ہوئی اور تباہی پھیلی۔ مگر یہ لوگ کیوں نہیں سوچتے کہ رسموں کیوجہ سے آدمی مشرک بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ پھر یہ کہ جن چیزوں کو یہ حضرات صریح شرک قرار دے رہے ہیں وہ شرک بھی ہے یا نہیں؟ وہاں تو برجستہ مشولے دئے جا رہے تھے۔

ذوق فون
ریز

مولانا نے (مولوی محبوب علی صاحب) راستے سے سید صاحب کو ایک خط لکھا جس میں اس بات پر ناگوارگی کا اظہار اور اعتراض تھا کہ آپ نے درانیوں سے صلح کیوں کر لی ہے جو مجاہدین و مہاجرین کے سردار بن رہے ہیں اور اسکو توکل و عزیمت کے منافی بتایا اور صاف صاف مشورہ دیا کہ پہلے ان کلمہ گو کافروں سے جہاد کرنا چاہئے

سیرت سید احمد شہید جلد ۲ ص ۵۲

غور فرمائیے یہاں اسلامی اخلاق فاضلہ کا کہیں دور دور پتہ نہیں چلتا جو ہندوؤں و سکھوں کیلئے بڑا تھا مگر مسلمان پٹھانوں کو کافر اور مشرک بنا کر شوق جہاد پورا کیا جا رہا ہے۔ اور یہی نہیں کہ یہ صرف مشورہ تھا۔ اس کا جواب بھی دیکھتے چلیں۔

انتشار اللہ تعالیٰ اس عاجز کا قصد ہے کہ بیس روز یا تقریباً ایک ماہ کے بعد پشاور جائے۔ میں نے ہرگز ہرگز منافقوں کیساتھ کوئی مصالحت نہیں کی ہے اور نہ کبھی ان سے موافقت کی کوئی راہ نکالی ہے

(مکتوبات سید احمد شہید ص ۲۱۰)

ہو رکھے جو رب

جواب فتویٰ

بنیادی نقطہ نظر کے باب میں فتویٰ بازی ہوتی رہی اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور ان کے مقلدین، معاوین شرک و کفر کی توپ بازی کرتے رہے نتیجہ یہ نکلا کہ پہاڑوں میں بسنے والے سافے لوگ جو سید صاحب اور ان کے غازیوں کے اتنے معتقد تھے کہ انکی سواروں کی خاک آنکھوں سے لگاتے تھے یکدم بھر ہم ہو گئے۔

یہ کہ شیخ اکرام ہی آگے چل کر لکھتے ہیں۔

اور شاید بعض مخلص قدیم انجیال ہستیوں کو بھی سید صاحب کے بعض ساتھیوں کے طور طریقے بلکہ عقائد بھی کھٹکتے ہوں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ سرداران پشاور اور علماء کا مجاہدین کے خلاف متحدہ محاذ قائم ہو گیا مجاہدین کے خالچ از اسلام اور واجب القتل ہونے کے فتوے دئے گئے

موج کوثر ص ۳۱

تنگ آئے ہوئے علمائے سرحد برحبتہ کہا کرتے تھے کہ

یہ لوگ مسلمانوں کے جان و مال کو کوئی چیز نہیں سمجھتے اور بلاوجہ شرعی مسلمانوں کی جان و مال پر دست درازی کرتے ہیں۔ بعض لوگ اس سے آگے بڑھ کر مجاہدین کو باغی مقتولین کو شہید کہتے تھے۔

سیرت سید احمد شہید ج ۲ ص ۲۲۴

مناظرہ بازی

اور پھر یہ اختلاف اتنے بڑھ گئے کہ پہاڑوں میں عین جہاد کے موقع پر بھی مناظرہ بازی کا شوق اور شرک و کفر کی الزام تراشی کا شعل جاری رہا۔ چنانچہ جناب شیخ اکرام لکھتے ہیں۔

لیکن جہاد کے دوران میں جب مخالفین عام مسلمانوں کو سید صاحب کے عقائد کے بارے میں بہکانے لگے انہوں نے بمقام پنچتار مذہبی مسائل کی تشریح کیلئے افغان علماء کو بلایا اور شاہ اسماعیل صاحب نے بڑی تابلیت سے مسئلہ عدم وجوب تقلید کی حمایت کی

موج کوثر ص ۲۱

اب تک تو ہم یہ سننے آ رہے تھے کہ یہ شرف صرف بغداد والوں کو حاصل تھا کہ دشمن سرحدوں پر آگ لگا رہا تھا اور اہل بغداد مناظرہ کر رہے تھے۔

مگر یہاں بھی تقریباً وہی صورت حال تھی گئے تھے جہاد کرنے اور پٹھانوں سے مناظرہ بازی کر رہے تھے یا پھر شرک کا فتویٰ لگا کر جہاد کی مشق فرمایا کرتے تھے۔

غالباً انھیں حالات کے پیش نظر مولوی محبوب علی نے (جنکا ذکر ہم کر آئے ہیں جو مجاہدین

کا ایک تافلہ لیکر سپاٹوں میں پہنچے تھے (بڑی عجیب بات کہی تھی کہ

تمہارے اوپر بیوی بچوں اور والدین کے حقوق میں تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ لوگوں نے کہا جہاد کی واسطے مولوی صاحب نے کہا جہاد کہاں ہے؟ اور کون کفار سے مقابلہ ہے کس ملک میں تمہارا عمل دخل ہوا۔ صبح سے شام تک تم لوگ کھانے پکانے کی فکر میں رہتے ہو جہاد کا محض بہانہ ہے تمہاری دنیا اور آخرت دونوں خراب ہیں

سیرت سید احمد شہید جلد ۵ ص ۵۵

اور پھر مولوی محبوب علی راجھوگڑ کر بہترے مجاہدین کیساتھ واپس ہو گئے پھر عرصہ تک ہندوستان سے رقوم اور قافلے دونوں بند رہے۔ اور ہزار جتن کے بعد پھر یہ سلسلہ جاری ہوا۔ غور فرمائیے کہ کیا یہی حال تبلیغی جماعت کا نہیں ہے؟ اور کمال یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مجاہدین بھی کہتے ہیں اور انکا دھندا بھی وہی ہے جو مولوی محبوب صاحب نے کہا ہے "صبح سے شام تک تم لوگ کھانے پکانے کی فکر میں رہتے ہو جہاد کا محض بہانہ ہے تمہاری دنیا و آخرت دونوں خراب ہیں"

یکہ طرہ کاروائی جناب شیخ محمد اکرام تبسم کرتے ہیں کہ اب تک پٹھانوں کے باسے میں جو کچھ کہا جاتا رہا ہے وہ اب تک یکطرفہ کاروائی تھی یا تو پٹھانوں کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی یا اس کے موقف کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا۔ اور پردہ پگندے کے زور پٹھانوں کو ظالم اور مجاہدین کو مظلوم قرار دے کر داستان کوئی شروع کر دی گئی۔ لکھتے ہیں

اس افسوسناک انقلاب احوال کا تجزیہ کرنا اور اس کے اسباب و لواوٹ ڈھونڈنا تاریخ نگار کا تلخ فرض ہے۔ لیکن آج یہ کام کسی قدر آسان ہو گیا ہے۔ اب تک اس سانحہ کے متعلق فقط سید صاحب کے عقیدت مندوں کے بیانات ملتے تھے جنکی ترجمانی عہد حاضر میں مولانا مہر نے بڑے جوش و جذبہ سے کی ہے

موج کوثر ص ۳

اگر غیر متعصبانہ طریقہ سے دیکھا جائے تو یہ بات باسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ پٹھانوں

نے کوئی نئی اور نوکھی حرکت نہیں کی تھی "مرتا کیا نہ کرتا" کے مصداق فتوؤں کا جواب فتوؤں سے دیا تھا۔ اور تلوار کا جواب تلوار سے

پھر اس باب میں صرف پٹھانوں ہی کو کیوں قابل ملامت اور لائق گردن زدنی قرار دیا جاتا ہے۔ سید صاحب کے مجاہدین اور غازیوں نے بھی تو فتویٰ ہی کی آڑ میں قسم کی تعدی سرکشی بلکہ بدکرداریاں روا کھی تھیں اور انتہائی دیدہ دلیری سے چلتی پھرتی روکیوں کو بنام جہاد اٹھا کر مسجد میں داخل ہو جایا کرتے تھے اور نکاح کے بغیر نہ چھوڑتے (گویا ان حضرات نے خانہ خدا کو شیروں کا بنار کھا تھا) غیر جانبدار شخص ان حالات کے پیش نظر اسے شرعی غنڈہ گردی کے علاوہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

مرگ حیف اسکے ہمراہیوں نے تو لڑائی نہ انسانہ اور اپنی خردماغی سے لٹیا ہی ڈبوی اور ایسا ستیاناس کر دیا کہ اس کو ملک پنجاب کو چھوڑتے بن پڑا

حیات طیبہ ص ۲۴۲

بہر صورت اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جو کچھ ہوا اسکی بنیاد نظریاتی اختلاف تھا اور اس کا پہلا بیج "تقویۃ الایمان" ہے اور اسکی بنیاد مولوی اسماعیل دہلوی نے رکھی جو عین جنگ کے وقت جب انکے مجاہدین کی پٹھانوں سے لڑائی ہو رہی تھی ان الفاظ میں ہدایات جاری فرماتے تھے۔

مولانا محمد اسماعیل صاحب نے حکم دیا کہ توپ کو کھینچ کر مسجد کے شمال مغرب کی ٹیکہ پر نصب کر دیا جائے۔ آپ نے بائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس طرف کنار پر مغرب لگانی چاہئے۔ دوسری جانب دائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس طرف منافقین پر

(سیرت سید احمد شہید ص ۳۲۶)

ع پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں

محبوب علی کا
عینہ و غضب

کردار کی بلندی

شوق فدا و شہادت

دہانی یا الہدیت

ایک ہی کنبہ کے لوگ

دہانی کہیں، یا اہل حدیث یا پھر محمدی بات ایک ہی ہے۔ حضرت بھی فرنگی دور کی برکات سے برصغیر کیلئے تحفہ میں یہاں ہم بطور خاص انکی سیاسی خدمات کا تذکرہ کرینگے اور پھر تاریکین خود ہی فیصلہ کرینگے کہ یہ لوگ کون ہیں صحیح یہ ہے کہ دیوبندی اور دہانی ایک کنبہ اور اعتقاد ایک ہی مکتبہ فکر کے زائیدہ ہیں۔

دیوبندی حضرات حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے قریب ہونیکے مدعی ہیں۔ اور دہانی خالص اسماعیلی فرقہ ہونیکے مدعی ہیں دوسرے لفظوں میں ”علائی“ ”آخانی“ بھائی بھی کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

اور زمانہ جدید کے اہل تعلیم جو ان حضرات کے مقلد و مداح ہیں ان دونوں کے مرکب کو مسک ولی اللہ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

اور جس مسک کو یہ حضرات مسک ولی اللہ کہتے ہیں وہ بھی عجیب چیز ہے جسکا تفصیلی جائزہ پھر کبھی انشاء اللہ تعالیٰ اور غالباً ہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ سید احمد بریلوی صاحب کی ہمنوائی میں پیش پیش ہیں۔ تو اہل حدیث حضرات مولوی محمد اسماعیل صاحب کی تعریف و توصیف میں اتنا آگے بڑھ جاتے ہیں کہ سید احمد صاحب بریلوی جو مولوی محمد اسماعیل صاحب کے مرشد و مخدوم ہیں انکی حیثیت بے حقیقت ہو کر رہ جاتی ہے۔ مثلاً مرزا حیرت جیب داستان حیرت ناک سناتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا سید صاحب پر تبرافرا ہے ہیں۔

اور شاید اسی وجہ سے ”جنگ آزادی ۱۸۵۷ء“ کے مصنف جناب الیوب صاحب نے دہانیوں کو تاریخی حیثیت سے انکی سرحدوں میں دھکیل دیا ہے اور تقریباً وہ تمام باتیں لکھ ڈالی ہیں جنکو چھپانے کی کوشش کی جا رہی تھی اور جواب آں غزل کے طور پر جناب برق التوحید صاحب نے دہانی اہل قلم خاصہ برق اندازی فرمائی ہے اور دیوبندی مکتبہ فکر کا کچا چٹھا کھول کر چوک میں رکھ دیا ہے۔

اس سلسلے میں کچھ روشنی جناب طفیل احمد صاحب منگلوری نے بھی اپنی کتاب مسلمانوں

کا روشن مستقبل میں ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں۔

سید صاحب بریلوی کا مذہبی مسلک ہمہ گیر تھا یوں کہتے کہ تو آپ کے مخالف آپکی جماعت کو دہانی کہتے تھے مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ جماعت دو مختلف اور متضاد گروہوں کے مرکب تھی جنہیں متحد رکھنے میں وہ مدت العمر سعی ہے۔ ان میں سے ایک گروہ کے سردار مولوی عبدالجی اور مولوی کریم علی جو پوری تھے جو اہلسنت کا طریقہ رکھتے تھے اور دوسرے گروہ کے سردار مولوی اسماعیل تھے جو چاروں اماموں کی تعقید سے آزاد تھے اور براہ راست حدیث کو اپنا ماخذ قرار دیتے تھے خود سید صاحب عمل کے اعتبار سے حنفی تھے مگر اسی کیساتھ مولوی اسماعیل کی جماعت کی سرپرستی کرتے تھے جو اپنے آپ کو محمدی کہتے تھے

(مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۱۱۸)

یعنی سید احمد صاحب بریلوی یہ بھی تھے اور وہ بھی تھے۔ بلفظ دیگر عملاً حنفی تھے اور اعتقاداً دہانی تھے اور انکے اپنے سلسلے کا نام محمدی تھا۔ اسے آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں بوقت ضرورت حنفی تھے اور جیب کوئی ضرورت نہ ہو تو محمدی تھے جناب شیخ محمد اکرام صاحب کتاب ”موج کثر“ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے سلسلہ کا نام طریقی محمدیہ رکھا تھا ان کا دستور یہ تھا کہ پہلے طریقہ چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ، سہروردیہ میں باوآز بند بیعت لیتے پھر طریقہ محمدیہ میں بیعت لیتے تھے۔ اس باب جناب محمد علی قصوری بھی اپنی کتاب مشاہدات کابل و یاغستان میں کچھ فرماتے ہیں۔ (چنانچہ باوجودیکہ وہ حنفی تھے لیکن بہت سے مسائل حنفی مسلک سے انحراف کر کے سنت کے مطابق یا کسی دوسرے مجتہد کے اجتہاد کے مطابق فتویٰ دیتے تھے اور اس مسلک کو انھوں نے مسلک احمدیت کے نام سے موسوم فرمایا مشاہدات کابل و یاغستان ص ۱۸) اب نہ جائے شاہ اسماعیل صاحب کس سلسلہ میں بیعت تھے کیونکہ انکے نزدیک ہر سلسلہ بیعت بدعت و ضلالت ہے۔

چنانچہ اپنی شہور کتاب تذکیر الاخوان بقیہ تعویۃ الایمان میں لکھتے ہیں۔

”تم اپنے دین میں کئی نئی رسم اور نئے نئے عقیدے اور طریقے نہ نکالو اور چھوٹ

نہ ڈالو کہ کون معتزلی ہوئے کوئی خارجی بنے اور کوئی رافضی اور کوئی ناصبی اور کوئی مرجی کہا دے پھر ان میں کوئی قادری کوئی سہروردی کوئی نقشبندی کوئی چشتی بنے انہ

(تذکرہ الاموال بقیۃ تعزینہ الایمان ص ۵ طبع دیوبند)

یہ بھی مجاہدین ہیں

دہائیوں کے پرجوش مورخین نے انھیں بھی مجاہدین کی صف اول میں شمار کیا ہے۔ حالانکہ پوری صدی گزر جانیکے باوجود اب بھی یہ حضرات افرادی لحاظ سے اتنی تعداد میں نہیں ہیں کہ کسی باقاعدہ فوج کی شکل اختیار کر سکیں۔ چنانچہ جناب ثناء اللہ امرتسری شیخ توحید میں فرماتے ہیں

امرتسری میں مسلم آبادی غیر مسلم آبادی (ہندو سکھ) کے مساوی ہے۔ اسی سال پہلے قریباً سب مسلمان اسی خیال کے تھے جنکو آج کل بریلی حنفی کہا جاتا ہے (شیخ توحید مکتبہ ثنائیہ مطبوعہ ۱۹۵۶ء ثناء اللہ امرتسری)

مگر اہل قلم فرماتے ہیں کہ مجاہدین تھے، سکھوں اور انگریزوں سے انھیں خاص دشمنی تھی، انگریز انکے نام سے قہراتے تھے سکھوں پر لڑ رہے طاری ہو جاتا تھا۔ تو ہمیں کیا انکار ہو سکتا ہے۔ میں قلم کی آبرو کا احترام ہے۔ ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ خشک و عیوس لوگ اول درجہ کے غازی اور مجاہد تھے۔ خواجہ ہی کی طرح تند خو اور جنگ جو تھے۔ اور یہ کہ انگریزوں کے ازلی دشمن بھی تھے۔ انکی ڈہکار سے سات سمندر پار کھلبلی مچ جاتی تھی۔

مگر خدا راہیں یہ بتایا جائے کہ ان واقعات و روایات کو کہاں رکھا جائے اور کس خانہ میں فٹ کیا جائے جو ان حضرات نے خود ہی مع تصدیقات کے رقم فرمائی ہیں۔ اور یہ روایات مراسم انگریز دشمنی کی نفی کرتی ہیں۔

مورخین کی ہٹ دھرمی

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ کچھ لوگ بہر صورت ثنا خوانی اور مدح سرائی کے قائل ہیں۔ چاہے حقائق و شواہد اور واقعات و روایات اسکی کتنی ہی کیوں نہ نفی کرتے ہوں۔ ہر حال میں انکی ضد اور ہٹ دھرمی باقی رہتی ہے ایک نے کہا تھا کہ بیس اور بیس ساٹھ ہوتے ہیں۔ دوسرے نے کہا غلط کہتے ہو

میں بیس چالیس ہوتے ہیں لہذا شرط لگ گئی۔ بیوی نے میاں سے کہا۔ میاں تم شرط مار جاؤ گے میں اور بیس چالیس ہی ہوتے ہیں۔ اُس نے ہنس کر کہا۔ میں بھی جانتا ہوں۔ مگر تو بڑی بھولی ہے جب میں مانوں گا تب ماروں گا۔ نہ میں مانوں گا نہ ماروں گا اس باب میں شیر بہادر پتی کا بھی یہی مسلک ہے۔ جناب پنی افادات مہر یہ میں لکھتے ہیں

میں مجاہدین کی شان و آبرو بہر حال قائم رکھنے کا قائل ہوں اگرچہ وہ بعض سابقہ بیانات اور توجیہات سے عین مطابق نہ ہو۔ افادات مہر ص ۲۳۱

اب آپ ہی فرمائیں جہاں یا مورت حال ہو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ یہ تو تاریخ کا منہ چڑھانیدنی بات ہے یعنی حقائق و شواہد چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہوں یہ حضرات مجاہدین کی شان بڑھاتے رہینگے۔ جناب مسعود عالم صاحب ندوی لکھتے ہیں

مولانا سندھی کی کتاب ”ولی اللہ اور انکی سیاس تحریک“ وسیع مطالعہ اور عمیق فکر کا نتیجہ ہے۔ مگر انھوں نے حزب ولی اللہ کی تشکیل اور من مانی توجیہ کی خاطر سید صاحب کے ماننے والوں پر بڑا ظلم کیا ہے۔ اور انکی کمزوریوں کی تنقید و مذمت میں ان کا قلم اعتدال پر قائم نہیں رہ سکا ہے (ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۱۰۰)

ان حالات و وجوہات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم تو یہی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ حضرات نہ تو اس قسم کے مجاہد تھے جنکی دھوم مچی ہوئی ہے۔ نہ ہی اس طرح کے غازی تھے جنکا شہرہ دور دور تک ہے۔

حق یہ ہے کہ اگر گہری نظر سے احوال و واقعات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات محقق ہو جاتی ہے کہ انگریزوں اور سید صاحب کے مابین کبھی ایک لمحہ کیلئے بھی جنگ نہیں ہوئی۔

بلکہ ہر دو فریق نے اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر ”کچھ بواور کچھ دو“ کے نظریہ کے تحت ایک دوسرے کیساتھ بھرپور تعاون کیا تھا انگریزوں کے دور میں انھیں ہر طرف سہولت حاصل تھی حتیٰ کہ ان حضرات نے انگریزوں ہی کے دور میں مجاہدین کی فوج بنائی۔ رضا کار تیار کئے۔

دعا گاہ لی

جسٹ برمن

جہاد کے لئے پورے ملک کا دودھ کیا۔ غریبوں، فقیروں، امیروں، دُریوں سے چندے جمع کئے
راجاؤں، نوابوں اور بڑے بڑے جاگیرداروں کی حاضری دی اور ہم جہاد تعاون حاصل کیا۔ اسے
اکٹھے کئے گئے۔ حرب و ضرب کی تربیت دی گئی۔ جنگ کی مقصود بند ہوئی۔ اور بغیر جنگ
کے غازی تیار کئے گئے اور نہ صرف یہ کہ انگریزوں نے انکی تیاریوں سے چشم پوشی کی۔ بلکہ ان کی
تیاریوں میں ان سے تعاون کیلئے واضح احکامات بھی جاری کئے گئے۔ اس سلسلے میں سفری
سہولتوں کا اس طرح بندوبست تھا کہ انگریز پورے پورے قافلے کا کھانا پکوانا حاضری دیتے تھے
آخر کیوں؟

ان حضرات کی یہ ناز برداری کیوں کیجاتی تھی۔ بلکہ متعلقہ حکام کو یہ تہنیت کیجاتی تھی کہ انھیں
خبردار کچھ نہ کہا جائے۔ یہ ہماری دروسری کا باعث نہیں بنیگے سرکار کو ان سے کوئی خطر نہیں ہے
جناب حین احمد صاحب مدنی لکھتے ہیں۔

سید صاحب کا مقصد ہندوستان کے ہندو اور مسلمان دونوں کو الیٹ انڈیا کے تسلط
واقترار سے نجات دلانا تھا۔ انگریزوں سے محسوس کرتے اور اس تحریک سے بہت
غلافت تھے اس بنا پر جب سید صاحب کا ارادہ سکھوں سے جنگ کر نیکا ہوا تو
انگریزوں نے اطمینان کے ساتھ اس کی ضرورتوں کے ہیا کرنے میں سید صاحب
کی مدد کی

(نقش حیات ص ۱۱۱)

آگے آگے دیکھے ہوتا ہے کیا۔ یہاں فرماتے ہیں کہ ارادہ سکھوں سے جنگ کر نیکا ہوا۔
آگے فرمائینگے سکھ نہیں۔ مراد انگریز تھے۔

مولانا مدنی کی منطق | مولانا مدنی اور انکی کتاب "نقش حیات" دونوں ہی عجیب
ہیں۔ گاندھی فلسفہ کے بھرپور حامل و متبع "یہاں بھی اسی
یہ بھی مقصد تھا اور وہ بھی" اگر جناب مدنی کی طرف اس کتاب کا تجزیہ کیا جائے
تو اس کے لئے یقیناً ایک الگ کتاب کی ضرورت ہوگی مثلاً اسی کتاب کے
ص ۱۲۲ پر تحریر فرماتے ہیں۔

سکھوں سے جنگ فقر و داریت کی بنا پر نہیں تھی بلکہ اس بنا پر تھی کہ وہ انگریزوں کے
حلیف اور مددگار تھے انگریزوں نے انکو ہندوستان میں اپنی حکومت کی حفاظت
کیلئے افغانستان کے راستے میں سد سکندری اور آہنی دیوار بنایا تھا اسی لئے ان
کا قلع قمع کرنا لازمی تھا

(نقش حیات ص ۱۲۲)

آپ یہاں کیا سمجھینگے یہی نا کہ اپنی اس آہنی دیوار میں رخنہ ڈالنے کیلئے اور اپنی سد سکندری کو
سمار کرنے کیلئے جناب سید احمد بریلوی اور انکے غازیوں کی مدد شروع کر دی اور انھیں بندو قوں
سنگینوں اور تیر و تفتنگ سے آراستہ کر کے کہا کہ جاؤ پہاڑوں میں جاؤ اور جہاد کے نام
پر ہماری آہنی دیوار کو مسمار کر کے ثواب دارین حاصل کرو۔

کیا انگریز اتنے ہی احمق اور بیوقوف تھے کہ اپنی ہی دیوار میں تڑوانے کیلئے سید صاحب
کو ہتھیار فراہم کر دیتے۔ اور کیا انگریز ہندوستان میں اتنے ہی کمزور تھے کہ سید صاحب اور
مولوی محمد اسماعیل صاحب سے خوفزدہ ہو کر انھیں مسلح کرنے لگے تھے۔ اور غضب یہ کہ
انھیں تحریک جہاد کیلئے سفری سہولتیں مہیا کر رہے تھے کہ مزید طاقتور ہو جائیں۔ ان توصیہات
سے کوئی سادہ مرید تو مطمئن ہو سکتا ہے مگر ان وضاحتوں سے دوسرے لوگوں کو مطمئن نہیں
کیا جاسکتا۔ مولانا مدنی کی یہ بیذہب منطق صرف انکے ارادت مند شاگردوں کے کام آ سکتی
ہے دوسروں کی فراست اسکی بلندی کو نہیں چھو سکتی۔

اس سلسلے میں ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے کہ سید صاحب اور انکے شریک کارامیروں
جاگیرداروں، راجاؤں، نوابوں کے پاس کھلے عام جایا کرتے تھے اور ان سے ہر قسم کا تعاون حاصل
کرتے تھے۔ کیا برٹش گورنمنٹ اتنی ہی بے خبر تھی کہ اسے انکی سرگرمیوں کا علم نہیں ہوتا تھا؟
حالانکہ انگریز گورنمنٹ کبھی بھی کسی دور میں بھی اتنی غافل اور بے خبر نہیں رہی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ
اُس نے نہ تو سید صاحب سے باز پرس کی اور نہ ہی اپنے وفادار نوابوں اور جاگیرداروں سے کچھ
پوچھا۔ پھر کیا کہا جائے۔ بات بڑھ جائے گی یا ران چمن جانے دو
مقصد جہاد کی وضاحت | مولانا مدنی مقصد جہاد پر بھی بحث فرماتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں

جہاد سے آپکا مقصد خود اپنی حکومت قائم کرنا ہرگز نہیں تھا بلکہ دین رب العلمین کی خدمت تھا

(نقش حیات ص ۳۲۱)

اور پھر اس خدمت دین رب العلمین کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں
بیشک سید صاحب جگہ اعلیٰ کلمۃ اللہ اور دین رب العلمین کی خدمت کا ذکر کرتے ہیں اور اسی کو اپنی مساعی کا محرک بتاتے۔ لیکن آپ خوب سمجھتے تھے کہ اعلیٰ کلمۃ اللہ کا ذریعہ صرف یہی نہیں ہے کہ ایک فرقہ وارانہ فرقہ قائم کیا جائے۔ اور خود حاکم بنکر دوسرے برادران وطن کو اپنا محکوم بنایا جائے۔ بلکہ اس کا سبب زیادہ موثر طریقہ یہ ہے کہ برادران وطن کو سیاسی اقتدار میں اپنا شریک کر کے اسلامی فضائل اخلاق سے انکے دلوں کو فتح کیا جائے۔ اقلیت و اکثریت کے مسئلہ کی کوئی پیچیدگی آپ کے ذہن میں نہیں تھی۔ کیونکہ آپ کے نزدیک یہ دونوں بے حقیقت چیزیں تھیں۔ جو اپنے عمل میں زیادہ پر جوش، فداکار، مہرگرم اور مخلص و دیانتدار ہوگا امامت اور لیڈرشپ اُسی کے ہاتھ میں ہوگی خواہ اقلیت کے فرقہ سے یا اکثریت کے فرقہ سے

(نقش حیات ص ۳۲۲)

یہاں اسکی تشریح میں اسکے علاوہ کیا کہا جاسکتا ہے کہ

لیکن غلاموں میں ایسے اصحاب علم و فضل ایسے ارباب فہم و دانش ایسے صاحبان زہد و تقویٰ ایسے حاملان کتاب و سنت بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں جو کافروں اور شرکوں کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے کے ذوق و شوق میں اپنے ہم زم زمیوں اور ہم قوموں سے جہاد کر سکتے ہیں

(امام اعظم محمد علی جناح اور انکا عہد ص ۱۹۵)

مسلمانوں ہی کے ہوسے چٹاؤں کو ترتر کر سکتے ہیں۔ انکے لئے انکے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں۔ مگر برادران وطن کی محبت میں مذہب و ملت کے اصولوں کو بدلا جاسکتا ہے

جناب بنگلوری فرماتے ہیں

ذاتی اعتبار سے مہاراجہ نجیت سنگھ کو مسلمانوں سے بظاہر کوئی تعصب نہیں تھا بلکہ ہندوستان کی دیگر اقوام کے مقابلہ میں مسلمان سکھ قوم سے قریب تر تھے۔ اگر سکھوں کو اور نجیت سنگھ کو مسلمانوں سے تعصب ہوتا تو پیر زادہ عزیز الدین انکے وزیر اور معتمد خاص کیوں ہوتے اور انکے توپ خانہ کا افسر اعلیٰ الہی بخش کیوں ہوتا اور وہ توپ خانہ الہی بخش کے نام سے کیوں موسوم ہوتا مگر انکی فرج اور انکے سردار یقینی طور پر بے قابو تھے۔

دہلی کی مغلیہ سلطنت جب کمزور ہوئی تو مرہٹوں نے شمالی ہند پر حملہ کر کے ملک کے بڑے حصہ پر قبضہ کیا۔ مرہٹوں اور راجپوتوں کی ریاستیں عرصہ دراز سے قائم تھیں اس لئے وہ ملک داری اور حکمرانی کے طریقوں سے بخوبی واقف تھے اور اپنی رعایا کے مذہبی جذبات کا پاس دلچاظ کرتے تھے چنانچہ مرہٹوں نے مسلمانوں کی عدالتوں کو جو قاضیوں کے تحت میں تھیں نجسہ قائم رکھا اسی وجہ سے مسلمانوں نے انکی عملداری کو دارالاسلام قرار دیا جہاں جہاد لازم نہیں آتا
مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۲۱۱

تو پھر سید صاحب نے بلاوجہ جہاد کا گورکھ دھندا پھیلایا تھا۔ وزیر بھی مسلمان تھا، توپ خانہ کا افسر بھی مسلمان تھا۔ اور سکھ مسلمانوں سے قریب تر بھی تھے۔ اب ہم کیا بتائیں کہ ہندوستان کے صدر ذاکر حسین بھی مسلمان تھے۔ کانگریس کے صدر ابوالکلام بھی مسلمان تھے اور دوسری اقوام میں بڑے بڑے کوتاہ دھرتا بھی مسلمان تھے، مگر اس سے کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے بھی خواہ بھی تھے۔ جہاں ہمنہ کا سودا سونے کے سکوں سے ہو جائے وہاں مسلمانی کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اور پھر مرہٹوں سے بھی جہاد نارا تھا۔ انگریزوں سے جہاد نا درست، ہندو برادران وطن، سکھ غیر متعصب اور قریب تر۔ مرہٹے کی حکومت دارالاسلام۔ پھر جھگڑا کیا تھا۔ کیا نہپاٹوں میں ہندو مسلمانوں کا قتل عام کرنے گئے تھے

سیاسی بلیک میلنگ

انگریزوں سے جہاد کے سلسلے میں جو بات سمجھیں آسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ان حضرات کے دوسرے تیسرے دور میں انگریزوں سے جہاں کہیں بھی جنگ وجدال کی نوبت آئی وہ صرف سیاسی مفاد کا ٹکڑاؤ تھا دوسرے لفظوں میں اگر اسے سیاسی بلیک میلنگ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ جب تک انگریزوں اور وہابیوں کا مفاد مشترک رہا کبھی ایک دہلی ٹکڑاؤ نہیں ہوا۔ انگریز مدد کرتا رہا اور مجاہدین سکھوں سے کم (کیونکہ وہ قریب تر تھے) اور بقول انکے مسلمان کافروں۔ افغانی منافقوں، پٹھان مشرکوں سے زیادہ جنگ کرتے رہے۔

اور اگر یہ صحیح ہے کہ *اَلْاَدْبِیُّ لَا یَکُونُ* تو نہیں کہنے دیجئے کہ ہم بیٹوں کو دیکھ کر باپوں کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہاں سالہا سال پڑھیلی ہوئی تاریخ کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو سوئے بازی کا ایک نہ ٹوٹنے والا تسلسل نظر آتا ہے۔ مثلاً یہ کہ مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے قائد اعظم سے تیس ہزار روپے طلب کئے۔ مگر قائد اعظم نے انکار کر دیا۔ تو پٹیل سے ابوالکلام صاحب کی معرفت ساٹھ ہزار میں سودا ہو گیا اور برادران مل بن گئے۔ جناب مفتی محمود صاحب نے جناب شورش کے قول کے مطابق صدر جنرل محمد ایوب خاں صاحب سے دو لاکھ روپے میں اپنے وٹ کا سودا کیا تھا۔ اسی طرح جناب ذوالفقار علی بھٹو سے سوئے بازی ہوئی اور سرحد کے وزیر اعلیٰ بنے حاصل یہ کہ جہاں سے کچھ مل گیا وہ برادر ہے اور نہیں تو سیاسی بلیک میلنگ جاری۔ اور یہ جراثیم چھوٹوں سے لیکر بڑوں تک میں یکساں طور سے موجود ہیں۔ یہاں بجا طور سے کہنا پڑتا ہے کہ

ایک ہم ہیں کر لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے بہر صورت اس جہاد میں پٹھانوں نے تلوار کا جواب تلوار سے دیا۔ اور سکھوں نے انگریزوں سے صلح کر لی اور مولوی اسماعیل دہلوی اور سید احمد بریلوی فتح کے یقینی الہامات سمیت قتل کر دئے گئے تو پہلا دور ختم ہوا۔ اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

چالیانہ گئے اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزوں کی خیال بہت گہری تھی۔ وہ بیک وقت تین قوتوں کو کمزور کر رہے تھے "سکھوں"، پٹھانوں اور سید صاحب کے مجاہدین کی

انگریز نہ صرف یہ کہ پورا برصغیر بڑپ کرنا چاہتے تھے بلکہ انکی حوصلے نگاہیں کابل و غزنی سے گذرتی ہوئی سمرقند و بخارا کو پار کر رہی تھیں چنانچہ جب تک وہابی سکھوں اور پٹھانوں سے ٹکراتے رہے۔ انگریز نہایت خاموشی سے حالات کا جائزہ لیتا رہا اور دونوں فریقوں کو اپنے مشوروں سے سرفراز کرتا رہا۔ اور جب اُسے یقین ہو گیا کہ پٹھان اور سکھ دونوں ہی کمزور ہو گئے ہیں تو انہوں نے سکھوں سے صلح کر لی اور مجاہدین کو جنگ بندی کا حکم دیدیا۔ (تفصیل آگے آرہی ہے)

حاصل یہ کہ ۱۸۳۱ء میں جنگ بالا کوٹ کے مجاہدین کا پہلا، دوسرا اور تیسرا دور بعد تحریک مجاہدین کا دور اول ختم ہو گیا اور اس دور میں مجاہدین کی انگریزوں سے کوئی جنگ نہیں ہوئی۔

۱۸۴۰ء میں مولوی نصیر الدین کے انتقال کے بعد بقول مولانا مہر اور ایوب قادری تحریک مجاہدین کا دوسرا دور بھی ختم ہوا اور اس میں بھی انگریزوں سے جہاد کا کوئی آئینہ نہیں ملتا بالآخر ۱۸۴۹ء اکتوبر ۱۸۴۹ء میں مولانا ولایت علی کو تحریک مجاہدین کی قیادت سپرد ہوئی اور یہاں اس تحریک کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ حالات و واقعات جناب ایوب قادری سے سنئے۔

مولانا ولایت علی نے تحریک مجاہدین کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی اسوقت کثیر کے راجہ گلاب سنگھ اور مجاہدین کے درمیان جنگ چھڑی ہوئی تھی راجہ کو شکست ہوئی اور اس نے انگریزوں کے سایہ میں جا کر پناہ لی جو اسوقت تک پنجاب کے ایک حصے پر قابض اور ملکی معاملات میں پوری طرح ذخیل ہو چکے تھے۔ مارچ ۱۸۴۹ء میں تمام پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا ۱۸۴۹ء سے تحریک جہاد کا ایک نیا موڑ شروع ہوتا ہے۔ چونکہ اب تک مقابلہ سکھوں سے تھا اس لئے سرکار کپنی خاموش تھی جب پنجاب پڑے طور انگریزوں کے قبضے میں آ گیا تو مجاہدین کی سرگرمیاں انگریزی حکومت کو ایک نظر نہ بھائیں۔

حکومت کے پیدا کردہ حالات سے مجبور ہو کر مولانا ولایت علی اور انکے بھائی مولانا عنایت علی اپنے وطن پٹنہ پنچے اور وہاں مجسٹریٹ کے سامنے دو سال کیسے چھلکے (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء)

کیا انصاف پسند حضرت جناب ایوب قادری کی مندرجہ بالا عبارت پر غور کر چکی زحمت کرینگے۔ اس عبارت سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ ۱۸۴۹ء تک انگریزوں سے جنگ نہیں ہوئی اور اس روایت کے بعد یہ بات بھی ناقابل یقین ہے کہ انگریز مجاہدین سے خوفزدہ تھے اور اسی خوفزدگی کیوجہ سے انگریز مجاہدین کیلئے اسلحہ فراہم کرتے تھے۔

اور یہ کہنا کہ حضرت مجاہدین خالص لوجہ اللہ جہاد فرماتے تشریف لے گئے تھے تو یہ بات بھی محل نظر ہے۔ ورنہ بتائیے کہ وہ کیا مصلحت تھی کہ ولایت علی اور عنایت علی صاحبان کو جہاد ترک کر کے بلند دیوالیہاڑوں سے نیچے اترنا پڑا حیات سید احمد شہید کے حوالہ سے کل محمد صاحب فیضی اپنی کتاب آزادی کی ان کہی کہانی میں لکھتے ہیں۔

جب گلاب سنگھ اور سرکار انگریزی کا آپس میں معاہدہ ہو گیا تو اسوقت سرکار انگریزی نے ایک خط بنام مولوی ولایت علی صاحب لکھا کہ اب گلاب سنگھ سرکار انگریزی کی حمایت میں ہے اسوقت اس سے لڑنا عین گورنمنٹ سے لڑنا ہے لہذا تم کو چاہئے کہ اس کے ساتھ لڑائی بند کر دو۔ (آزادی کی ان کہی کہانی)

اور پھر اس حکم نامہ کے تحت جنگ بند ہو گئی فیضی صاحب لکھتے ہیں

اس کے بعد لڑائی بند کر دی، ہتھیار سرکار کے پاس جمع کروائے اور قیمت وصول کر لی اور انگریزوں نے مجاہدین کا شاندار استقبال کیا اور ان کی دعوتیں بھی لیں۔ (آزادی کی ان کہی کہانی ص ۱۷۷)

ان واقعات کی تفصیل "حیات سید احمد شہید" سے بھی ملاحظہ فرمائیں مولوی محمد جعفر نقاشی لکھتے ہیں

اسوقت انگریزی سرکار نے ایک خط بنا، مولوی ولایت علی صاحب اس مضمون کا لکھا کہ گلاب سنگھ نے سرکار انگریزی سے معاہدہ کیا ہے۔ اور اس معاہدہ کے بموجب وہ گورنمنٹ انگریزی کی حمایت میں ہے اسوقت اس سے لڑنا عین گورنمنٹ سے لڑنا ہے لہذا تم کو چاہئے کہ اب اس کے ساتھ لڑائی بند کر دو۔ (حیات سید احمد شہید ص ۳۳۹ جعفر نقاشی)

ص ۳۳ پر لکھتے ہیں۔

اس وقت مجاہدین اور روہیلہ فوج لڑنے کی تیاری تھی مگر مولوی ولایت علی صاحب نے لڑنے کو قربین مصلحت نہ سمجھ کر انگریزی سرکار کے افسروں کی اطاعت قبول کر لی (حیات سید احمد شہید ص ۳۴)

مولانا ولایت علی کی لاہور میں آمد

یہ دونوں حضرات (یعنی میرا ولایت علی اور مولوی ولایت علی) مع فوج و توپ خانہ وغیرہ سامان جنگ کے لاہور پہنچے۔ ان ایام میں جان لارنس صاحب بہادر پنجاب کے چیف کمشنر تھے چیف کمشنر صاحب بہادر نے دو منزل آگے بڑھ کر مولوی صاحبوں کا استقبال کیا اور نہایت گرم جوشی سے ان کو لاہور لائے اور بہت تعریف اور مدح و شجاعت اور ہمدردی ان حضرات کی کر کے۔ ضامن شاہ رئیس بالاکوٹ پر اسکی بیوفانی کیوجہ سے بہت تقریب کی اور بہت سی گفتگو کے بعد جان لارنس صاحب بہادر اور ان دونوں حضرات کے درمیان یہ بات قرار پائی کہ دونوں حضرات مع ان ہندوستان مجاہدین کے اپنے وطن کو واپس جائیں اور تمام اسلحہ جات مع توپ خانہ انگریزی سرکار کے ہاتھ فروخت کر کے روپیہوں کی بقایا تنخواہیں دے کر انکو بروااست کر دیں۔

(حیات سید احمد شہید ص ۳۴۱)

اور یہی تھا نیسری صاحب لکھتے ہیں "آخر کار ۱۸۴۵ء یعنی موکر بالاکوٹ کے پندرہ برس بعد کل سلطنت پنجاب متعصب سکھوں کے ہاتھ سے نکل کر ہماری عادل سرکار کے قبضہ میں آگئی۔ کتاب مذکور ص ۲۹۱"

مجاہدین کی دعوتیں اور پٹنہ کوروانگی
دعوتوں کے سلسلے میں ہم دو حوالے "سیرت میرا محمد شہید مصنفہ جناب ابوالحسن علی ندوی ص ۱۱۷

اور ص ۲۱۹ سے اپنی کتاب "ہاتھی کے دانت" میں لکھ چکے ہیں۔ اور وضاحت کی ہے کہ یہ مجاہدین حضرات کس طرح انگریزوں کی دعوتیں اڑایا کرتے تھے۔ اور انگریز کس طرح ان کے لئے کھانے پکوا پلا

ص ۱۷۷ ہاتھی کے دانت۔ مکتبہ قدوسیہ سے طلب فرمائیں

کرچیم براہرہا کرتے تھے وہ جہاد سے پہلے کی ابتدائی دعوتیں تھیں اور اب حصول مراد کے بعد کی دعوتیں بھی دیکھئے۔

انگریزوں کا دور

سر جان لارنس صاحب بہادر نے ایک روز گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے مولوی صاحب کی مع کل مجاہدین کے دعوت کی اور دوسرے روز خود صاحب مہرج نے اپنی طرف سے قافلہ کی دعوت کی تیسرے روز مولوی رجب علی صاحب نے جو چیف کمشنری پنجاب کے میسنرشی تھے دعوت کی اسکے بعد اپنے صرح سے انگریزی سرکار نے باہتمام واکرام مولوی صاحب کو مع یقینہ مجاہدین کے پیشہ پنچا دیا۔ (حیات سید احمد شہید ص ۳۲)

یہ تمام باتیں ہمارے اس موقف اور نظریات کی تائید کرتی ہیں کہ ان مجاہدین نے انگریزوں سے کبھی بھی کوئی باتا نہ جنگ نہیں کی بلکہ انگریزوں کی سازش کا شکار ہوئے، یا پھر انگریزوں سے سیاسی سود سے بازی کرتے رہے یعنی ادھر تم ادھر تم مگر انگریزوں سے کہیں زیادہ چالاک تھا اس نے انکی ہر سیاست پٹ کر دی اور وہابی اسٹیٹ کے قیام کا خواب درہم برہم ہو گیا۔ ان حضرات نے انگریزوں کے عطا کردہ ہتھیاروں کے بل بوتے پر سکھوں سے جنگ کی۔ پٹھانوں کو پامال کیا۔ اور انگریزوں کی گلاب سنگھ کی صلح کے بعد ہتھیار مع توپ خانہ انگریزوں کو واپس کر دئے (اور انعام بنام فروغی ہتھیار حاصل کئے)

البتہ پٹھانوں کا قتل بنام جہاد بطور منافع ملا۔ اس باب میں جناب مسعود عالم صاحب ندوی رقمطراز ہیں

اس وقت کشمیر کے راجہ گلاب سنگھ اور مجاہدین کے درمیان جنگ ہو رہی تھی۔ راجہ کو شکست ہوئی اور اس نے انگریزوں کے سامنے میں جا کر پناہ لی جو اس وقت تک پنجاب پر قابض ہو چکے تھے حکومت نے مولانا ولایت علی کو اطلاع دی کہ اب گلاب سنگھ پر حملہ خود انگریزی حکومت سے لڑائی مول لینا ہوگا حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ مجاہدین کے ذریعہ سکھوں کی طاقت توڑ دی جائے اسلئے شروع شروع میں مجاہدین سے روک ٹوک نہیں کی گئی لیکن پنجاب کا اکثر حصہ انگریزوں کے قبضے میں آ گیا تو مجاہدین حکومت کی نگاہ میں کھٹکنے لگے۔ مجاہدین بھی

خواجہ حکومت سے بڑا آزما ہونا خلاف مصلحت سمجھتے تھے (ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۵)

کیا اس روایت کے بعد بھی کوئی شک و شبہ رہ جاتا ہے۔ یہ بات جو سید صاحب کے بہت بڑے حمایتی نے کہی ہے اگر کوئی اور کہدیتا تو خوفناک دھماکوں سے زمین تھرا اٹھتی۔ مگر یہ بات جناب مسعود عالم صاحب ندوی نے فرمائی ہے اس لئے اسٹیج خاموش ہے۔ ظاہر ہے کہ گلاب سنگھ نام نہاد مجاہدین اور انگریزوں کے دباؤ کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ لہذا وہ انگریزوں کے زیر سایہ آ گیا۔ اور یہی انگریزوں کا مقصد تھا جو تیسرے دور میں پورا ہو گیا۔

ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب مجاہدین کا اصل مقصد انگریزوں سے جہاد تھا۔ یعنی پہلے سکھوں کو ختم کر کے۔ بلکہ اس سے بھی پہلے پٹھان مشرکوں کی صفائی تھی۔ پھر سکھوں کی پھر انگریزوں سے اصلی جہاد تھا تو سکھوں کے خاتمہ کے بعد توپ خانہ انگریزوں کے حوالے کیوں کر دیا گیا اصل جہاد تو اب شروع ہونا تھا پھر خلاف مصلحت اور "خواجہ" کیوں ہو گئی۔ بینوا تو جہاد کھیر لپکاٹی جتن سے چرخر دیا جلا آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

بڑے حضرت کا الہام اور چھوٹے حضرت کی تاویل یوں تو سید یاد شاہ الہاموں کے بادشاہ

بھی تھے پوری تاریخ نت نئے الہاموں سے لبریز ہے اگر ان بڑے حضرت کے الہامات ہی جمع کئے جائیں تو یقیناً ایک ضخیم کتاب جمع ہو سکتی ہے۔ مگر ہم یہاں بطور تبرک مولوی محمد جعفر تھانسیسری کی کتاب "حیات سید احمد شہید سے صرف اقتباس درج کرتے ہیں اور قارئین کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

علاء سید محمد یعقوب کی روایت | سید محمد یعقوب آپ کے بھانجے سے روایت ہے کہ قوتِ رواں کی ضرورت آپ اپنی ہمیشہ یعنی والدہ سید محمد یعقوب سے رخصت ہونے لگے تو آپ ان سے فرمایا کہ اے میری بہن میں نے تم کو خدا کے سپرد کیا۔ اور یہ بات یاد رکھنا کہ جب تک ہندو کا شرک اور ایران کا رفس اور چین کا کفر اور افغانستان کا نفاق میرے ہاتھ سے ہو ہوگا ہر مردہ سنت زندہ نہ ہوئے گی اللہ رب العالمین مجھ کو نہیں بھڑکائے گا

جو امیر حبیب اللہ اور انگریزوں کے قبضے میں نہیں تھے انہوں نے امیر حبیب اللہ کا مطیع کر دیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں امیر حبیب اللہ کی اطاعت انگریزوں کی اطاعت تھی۔ امیر حبیب اللہ ان اطاعتی خطوط سے اتنے خوش ہوئے کہ انھیں ملائیشیا کا خطاب عطا فرمایا بلکہ پورے پاکستان کیلئے اپنی طرف سے مختار نامزد کر دیا امیر حبیب اللہ کو انگریزوں نے تخت نشین کیا تھا اور لاکھ لاکھ سے اٹھارہ لاکھ روپے صرف اس لئے ادا کرتے رہے تھے کہ امیر صاحب افغانی قبائل کو ہندوستان پر بلنار کرنے سے روکتے رہینگے اور امیر حبیب اللہ غالباً یہ کام مولوی بشیر سے لیتے تھے۔ اگر تاریخ کا لبور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل روشن ہو جاتی ہے کہ امیر حبیب اللہ دوسری پالیسی پر عمل کرتے تھے ایک طرف انگریزوں کو دفاع داری کی یقین ربانی کرواتے تھے اور دوسری طرف مجاہدین سے وعدہ وعید کرتے رہتے تھے تاکہ بوقت ضرورت کام آئیں۔

کیا شیخ صاحب نہیں جانتے کہ بات جب دکھ کی ہو تو دکھ ہی ہوتا ہے۔ مداحین حضرت بڑے جتن سے مجاہدین کی شان و عظمت کا ایک گھروند اُبناتے ہیں اور پھر اچانک ہی حقانی کا ایک جھوٹا نکاریت کے ان گھروندوں کو نابود کر دیتا ہے۔

از مشاہدات کابل و یاغستان

زیر قلم سطور کے باوجود میں یہ خاکسار بھی وہی کچھ عرض کر چکا ہوں لانا محمد علی قصوری نے لکھا ہے کہ ان حالات و واقعات کو پڑھ کر عبرت حاصل کیجائے جناب قصوری تحریر فرماتے ہیں

زبردست اسلاف کے جانشین نہایت نالائق اور نااہل لوگ بن گئے۔ جنھوں نے عقیدت سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور اس روپیہ کو جو جہاد کیلئے بھیجا جاتا تھا اپنی عیش پرستیوں کیلئے برباد کرنا شروع کیا۔ چونکہ اس جماعت کے سرحدی لیڈروں کی سرگرمیاں پچیس سال میں نہایت شرمناک رہی اور وہ عام مشائخ اور پیروں کی طرح ہر قسم کے فریب اور جھوٹ سے اپنی دکان کی روٹی بڑھاتے رہے ہیں اور ہندوستان کے نہایت مخلص آدمیوں کو بھی اپنا آلہ کار بنانے سے نہیں چوگے (اور میں خود بھی انکے فریب کا شکار رہ چکا ہوں) اس لئے میں

چاہتا ہوں کہ انکے پوست کندہ حالات بیان کروں اور مجھے ان کے درمیان وہ کچھ حالات کا علم ہو جو انھیں جماعت اہل حدیث اور عام مسلم بینک کے فائدے کیلئے بے نفاع کر دوں تاکہ لوگ آئندہ انکی دھوکہ بازیوں سے بچیں۔

(مشاہدات کابل و یاغستان ص ۹۳)

مجاہدین کا بیت المال

جسکے بلا شرکت غیرے مالک امیر المجاہدین جناب نعمت اللہ صاحب تھے اور اللہ کی یہ تمام نعمتیں انھیں کے لئے وقت تھیں، وہی اسکے مالک و مختار تھے جسکو چاہتے نعمتوں سے نوازتے اور جس کو چاہتے محروم کر دیتے۔ جناب قصوری لکھتے ہیں۔

کسی شخص کو بیت المال کے متعلق امیر صاحب سے سوال کرنا صحیح نہ تھا میں نے سنا کہ بعض گستاخوں نے بیت المال کے متعلق سوال کرنا کی جسارت کی مگر اسکا جواب یہ ملا کہ رات کو چپکے سے امیر صاحب کے مستند انھیں ختم دیتے تھے۔ اور پھر اسکا ذکر بھی کوئی نہ کرتا تھا۔

(مشاہدات کابل و یاغستان ص ۹۴)

امیر نعمت اللہ اور پیاروں کی بیٹیاں

محل وقوع کے اعتبار سے وہ علاقہ نہایت حسین، پر فضا، جنت نظر تھا۔ پھولوں،

بنفشہ زاروں کی بہتات تھی چشموں کی فراوانی نے ہر طرف حسن و شادابی بکھیر رکھی تھیں۔ مولانا محمد علی نے ان علاقوں کے حسن کے وصال کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے، لکھتے ہیں جب میں وہاں پہنچا تو اس جماعت کی عنان اقتدار امیر نعمت اللہ کے ہاتھوں میں تھی۔

امیر نعمت اللہ مرحوم مسلمان امراء و مشائخ کی طرح عورتوں کے بیحد شوقین تھے تین تو ان کی نکاحات بیویاں تھیں اور دس بارہ نہایت خوبصورت لڑکیاں بطور خادماؤں کے رکھتے تھے امیر حبیب اللہ خاں کی طرح امیر نعمت اللہ کا بھی زیادہ وقت انھیں نوجوان لڑکیاں سے لہو و لعل میں گذرتا تھا۔

(مشاہدات کابل و یاغستان ص ۹۵)

۲۰ ایک خاص حلقہ ان لوگوں کا تھا جو امیر صاحب کے حوالی موالی تھے انھیں اپنی خدمات کے صلے میں امیر صاحب ہمیشہ داد و دہش سے نوازتے رہتے تھے ان سے بعض لوگ تو امیر صاحب کے جاں نثار خدام میں سے تھے جو امیر صاحب کے ذاتی اشلے پر ہر قسم کے بھلارم کرنے پر آمادہ و تیار رہتے تھے مثلاً اگر امیر صاحب کی خادماؤں میں سے کوئی بڑی حاملہ ہو جائے تو اسکے بچے کو پیدا ہونے کے بعد گلا گھونٹ کے چپکے سے دریا برد کر دیتا امیر صاحب کی عادت تھی۔ ان خادماؤں کو اکثر بدلتے رہتے تھے۔ جو خادماں اس طرح الگ کیجاتی تھیں۔ انکی شادیاں انھیں لوگوں میں سے کسی ایک سے کر دی جاتی تھی۔ اور اسے نہایت عمدہ چیز اور ماہوار خرچ ملجاتا تھا اور یہ امر اس درجہ ازبوناک تھا کہ ان میں سے جو بڑی غیر معمولی طور پر خوبصورت ہوتی وہ شادی کے بعد بھی امیر صاحب کی توجہات کا مرکز بنی رہتی۔

(مشاہدات دہلی و یاغستان ضلہ)

ایک اور اندوہناک انکشاف

بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سب ان اللہ اور ان سے چھوٹے ماشاء اللہ اور انکا مجموعہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اگر یہ لوگ واقعی ایسے ہی تھے جیسا کہ مولانا قصوری نے تحریر فرمایا۔ بلکہ یہ لوگ یقیناً اسی فطرت کے تھے تو انھیں کیا کہا جائیگا۔

کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ ان کا سارا پروگرام ہی سونما تھکے کے پنڈتوں کی طرح تھا «بابر بھی اندر سجن» اور انکی خفیہ کاروائی تو بالکل ہی مندروں میں رہنے والے جاں نثاروں کی طرح تھی۔ میں جب نے ان معاملات و واقعات کی تحقیق کر دیا ہوں (جواب بھی جاری ہے) ایک خیال بار بار میرے ذہن کو جھنجھوڑتا رہا ہے۔ کہ یہ لوگ ہندوستان اگر اپنے بال بچوں میں رہ کر دوبارہ کیوں پہاڑوں کی طرف نکل جاتے تھے۔ اسکی وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ ان حضرات نے پہاڑوں میں بھی «بال بچے» بنا لئے ہوئے تھے اور بے شمار چندوں پر عیش کرتے تھے

پھر انھیں ان شاداب وادیوں کو چھوڑ کر اور انکی حسین مٹیوں سے منموڑ کر ہندوستان میں رہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب سنے نعمت اللہ کے بعد امیر برکت اللہ کی داستان دل گذار جناب قصوری لکھتے ہیں۔

امیر نعمت اللہ کے بعد انکے برادر امیر رحمت اللہ جماعت میں صاحب اثر و مورخ تھے مگر چونکہ بیت المال امیر نعمت اللہ کے قبضے میں تھا اس لئے ہر شخص امیر صاحب کی نظر عنایت کا محتاج تھا ورنہ فاقہ کشی سے خاتمہ یقینی تھا۔ امیر نعمت اللہ نے اس قدر ہوشیاری سے اپنا حال بچھا رکھا تھا کہ کوئی شخص انکے سامنے دم نہ مار سکتا تھا

رحمت اللہ بھی اپنے بھائی کی طرح بہت بدچن اور آوارہ مزاج نوجوان تھے۔ اگر امیر نعمت اللہ کو برکیوں کی رغبت نے معطل کر رکھا تھا تو انھیں نوجوانوں کی محبت نے دنیا و مافیہا سے بے خبر بنا رکھا تھا.....

امیر نعمت اللہ کی اولاد نیز میں سے سب سے بڑا بڑا برکت اللہ تھا۔ جو غالباً اس وقت نوسال کا تھا بڑا کا خاصا خوبصورت اور بگڑا ہوا صاحبزادہ تھا ہر وقت دو تین ادباش نوجوان اسکی مصاحبت میں رہتے اس لئے اس کا آوارہ ہونا لابدی تھا

(مشاہدات دہلی و یاغستان ضلہ)

شرمناک ہتکنڈے

ایک تھے مولوی ولی محمد صاحب جنکا نام مولوی محمد موسیٰ رکھا گیا تھا حال یہ تھا کہ شاذ و نادر ہی کوئی اہلی نام سے رہتا تھا مثلاً یہ کہ جناب مولوی محمد علی صاحب کا نام بھی محمد سلیمان رکھا گیا تھا۔ حال یہ کہ مولوی ولی محمد صاحب پنجاب کے نہایت مخلص کارکن تھے۔ یہ شمار چندہ بھیجا کرتے تھے یہ جب دہاں پہنچے تو قصوری صاحب سے

امیر نعمت علی نے مولوی محمد موسیٰ کو (ولی محمد کو) اپنے ہاتھ میں لینے کیلئے پہلے انکی شادی ایک خوبصورت بڑی سے کر دی اسکے چند ماہ بعد ایک دوسری خوبصورت بڑی

... سے ان کی شادی کر دی اب ان کی دو بیویاں ہو گئیں۔ پھر یہ نتیجہ نکلا دلی محمد صاحب
یعنی محمد موسیٰ صاحب بالکل مغلوں ہو گئے جناب قصوری صاحب انکی زبانی لکھتے ہیں کہ

پیدائشوں نے امیر نعت اللہ کی بدعنوانیاں، ان کا عورتوں کیساتھ شفقت، انکی
جہاد سے غفلت و اعراض جماعتی فتنہ کو اپنے اغراض مشورہ کی تکمیل کیلئے بے دریغ
استعمال کرنا سب پیش کئے۔ اور کہا کہ مجھے تو شرم آتی ہے کہ میں پنجاب میں اس
کے متعلق اتنا جھوٹا پروپیگنڈا کرتا رہا اور لوگوں کو جماعت کے فرضی کارناموں
کی داستانوں سے اپنی طرف مائل کرتا رہا یہاں آکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں پنجاب
میں حالت خواب میں تھا اور اب آنکھیں کھلی ہیں تو ایک بھیانک منظر سامنے
ہے۔

(مشاہدات کابل و یاغستان ص ۱۱۳)

ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ مجاہدین کی اکثر داستانیں فرضی اور جھوٹی ہیں۔

مولانا قصوری کا اظہار حقیقت۔ بلا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے

یہ مسئلہ انقلابی تحریکیں لیڈر پیدا کرتی ہیں یا لیڈر اپنی ہوشیاری، تدبیر اور قربانی و اثبات سے
انقلابی تحریکوں کو چلاتے یا کامیاب بناتے ہیں مرغی اور اندے کے پیدائش کے مسئلہ کی طرح لاخیل
ہے مگر ہم نے تو آزما کر دیکھا کہ اکثر تحریکیں لیڈروں کی نا عاقبت اندیشی یا بزدلی سے ناکام ہو گئیں۔
ہندوستان میں ہم نے مسلمانوں کی مذہبی تنظیم کی تحریک اٹھائی مگر اس میں بھی غلطی یہ کی کہ۔
مولانا ابوالکلام کو امام انہدینا کہ تمام تحریک ان کے بل بوتے پر کھڑی کی لیکن عین وقت پر مولانا
آزاد کی بزدلی نے تمام کھیل بگاڑ دیا۔ اور سائے کا سارا محل جبکی تعمیر پر لاکھوں روپیہ صرف ہوا
تھا اور سیکڑوں مسلمانوں نے اسے اپنے خون سے سینچا مولانا کی گریز پائی کی وجہ سے
ان کی آن میں دھڑام سے نیچے آگرا۔

اس طرح سلطان ابن سعود کی تحریک "الاخوان" جسکے متعلق اچھے اچھے مبصروں کا
خیال تھا کہ عرب کی کایا پلٹ دے گی وہاں لیڈروں کی نالائقی اور کوتاہ اندیشی کا شکار ہو گئی
یہی حال ہماری تحریک کا ہوا۔ ہماری تحریک ایک ہزار بردست انقلابی تحریک تھی مگر اس کا

مور امیر حبیب اللہ کی ذات حق اور اپنے حسن ظن یا نا تجربہ کاری کی بنا پر نہ سوچا کہ امیر حبیب اللہ
اپنی فطرت کو کیونکر ترک کر سکتا ہے۔

(۹۷ مشاہدات کابل و یاغستان)

انگریزوں کے دوست جناب ایوب قادری صاحب اپنی کتاب "جنگ آزادی"
۱۸۵۷ء میں علمائے اہل سنت پر خاصے برہم نظر آتے ہیں۔

اور کہیں کہیں تو خوب گرجے برہم بھی ہیں۔ جناب قادری کی نظریں وہابیوں کی پامالی اور شکست
کی تمام تر ذمہ داری علمائے اہل سنت پر عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے سستی علماء پر خاصی تنقید
فرمائی ہے۔ مگر اسکے ساتھ ہی لگے ہاتھوں وہابیوں کا بھی تیا پا چا کر ڈالا ہے۔ اور شاید خوش و خیر
میں بہت سی دھکی پھپی باتوں کا اظہار بھی ہو گیا ہے۔ لکھتے ہیں

✓ مولوی محمد حسین صاحب بناوی نے سرکار برطانیہ کی وفاداری میں جہاد کی منسوخی
پر ایک مستقل رسالہ "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" ۱۲۹۲ھ میں لکھا انگریزی
اور عربی زبانوں میں اسکے ترجمے ہوئے۔ یہ رسالہ سرچارلس ایچینسن اور سر جیمس
لائل گورنران پنجاب کے نام معنون کیا گیا۔
جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۶۷

یہی نہیں بلکہ اس کا رخیر کیلئے ملک کے دور دراز علاقوں کا سفر بھی کیا اور ملک بھر کے
علمائے اہل حدیث سے توافقی و تائید بھی حاصل کی جناب سعود عالم صاحب ندوی لکھتے ہیں

✓ اس کتاب پر مولوی محمد حسین بناوی انعام سے بھی سرفراز ہوئے جماعت اہل بیت
کو فرقے کی شکل دینے میں ان کا خاص حصہ ہے اور یہ بزرگ ہیں جنہوں نے
اس سادہ لوح فرقے میں وفاداری کی تولد پیدا کی۔ نہ صرف یہ ہوا بلکہ معاصر علماء
سرکاری مخالفت کے طعنے بھی دئے۔
(ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۲۱۲)

یہی مولانا ندوی اس کتاب میں فرماتے ہیں۔

معتبر اور ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ اسکے معاوضہ میں سرکار انگریزوں سے انھیں

جاگیر بھی ملی تھی اس رسالہ کا پہلا حصہ پیش نظر ہے۔

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ۲۹

اگر بتور دیکھا جائے تو پوری کتاب تحریف و تدلیس کا عجیب و غریب نمونہ نظر آئے گی۔ مولوی عبد المجید خاں سوہدروی سیرت ثنائی کے ص ۲۴۲ میں جو کچھ لکھا ہے۔ اُسے جناب ایوب قادری بیان فرماتے ہیں۔

مولوی محمد حسین ثناوی نے اشاعت السنہ کے ذریعہ اہل حدیث کی بہت خدمت کی لفظ دہائی آپ ہی کی کوشش سے سرکاری دفاتر اور کاغذات سے منسوخ ہوا اور جماعت کو اہل حدیث کیساتھ منسوب کیا گیا آپ نے حکومت بھی کی اور انعام میں جاگیر بھی پائی

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۶۵

علامی کی فخریہ پیشکش

اگر ان حضرات سے یہاں یہ کہہ دیا جائے کہ بتوں سے تھکو امیدیں خدا سے ناامیدی۔ تو ناراض ہو جائیگے اور عیوب کا سارا جہاں و جلال غریب علمائے اہلسنت کیطرف اُلٹ پڑے گا۔ حیرت ہے کہ یہاں انکی خود ساختہ توحید میں ذرا بھی فرق واقع نہیں ہوتا۔

اور یہاں یہ بھی یاد ہے کہ اس سلسلے میں ثناوی صاحب نے متعدد درخواستیں بھی دی تھیں۔ گورنروں کی خوشامدیں اور چالیوسیاں بھی کی تھیں اور کاسہ لیبی کی انتہا کر دی تھی جناب ایوب قادری لکھتے ہیں!

اس گروہ اہلحدیث کے تیر خواہ و وفا دار عایا برٹش گورنمنٹ ہونے پر ایک بڑی اور روشن اور قوی دلیل یہ ہے کہ یہ لوگ برٹش گورنمنٹ کے زیر حمایت رہتے تو اسلامی سلطنتوں کے ماتحت رہنے سے بہتر سمجھتے ہیں

اور اس امر کو اپنے قوی دلیل «اشاعت السنہ» کے ذریعہ سے جسکے نالہ جلد میں اس امر کا بیان ہوا ہے اور وہ نمبر ہر ایک لوکل گورنمنٹ «گورنمنٹ آف انڈیا» میں پیش چکا ہے گورنمنٹ پر ظاہر اور مدلل کر چکے ہیں جو آج تک کسی اسلامی

فرقہ رعایا گورنمنٹ نے ظاہر نہیں کیا اور نہ آئندہ کسی سے ظاہر ہونے کی امید ہو سکتی ہے (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۶۷)

ان واقعات کی تفصیلات اشاعت السنہ لاہور جلد ۱ شمارہ ۷۱ اور ۳۹ ماہر صدیقی ص ۱۲۲ میں بھی ملاحظہ کیا سکتی ہیں اسی طرح ملکہ وکٹوریہ کے جشن جولائی پر جو ڈریس مولوی محمد حسین ثناوی نے گروہ مسلمانان اہلحدیث کیطرف سے پیش کیا تھا اُسے بھی ایوب قادری کی زبانی ہی سننے چلیں

یہ مذہبی آزادی اس گروہ کو خاص کر اس سلطنت میں حاصل ہے بخلاف دوسرے اسلامی فرقوں کے کم ان کو اور اسلامی سلطنتوں میں بھی آزادی حاصل ہے اس خصوصیت سے یہ یقین ہو سکتا ہے کہ اس گروہ کو اس سلطنت کے قیام اور استحکام سے زیادہ مسرت ہے اور ان کے دل سے مبارکباد کی صدائیں زیادہ زور کیساتھ نعرہ زن ہیں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء

سرکار پرستی اپنے عروج پر کیا یہ تصویر انھیں لوگوں کی نہیں؟ جنکی بے پناہ انگریز دشمنی کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے جنکی شجاعت بہادری کے نقائصے بجائے جا رہے اور جن کی دینی غیرت کے ترانے گائے جا رہے ہیں ہمارا خیال ہے کہ حکم جہاد کی منسوخی پر صرف وہی گروہ نے فتائے شایع کئے ہیں ایک قادیانیوں نے دوسرے انکے ہم قافیہ دہائیوں نے

قادیانیوں نے بھی برٹش گورنمنٹ کو غنیمت اور ذریعہ نجات سمجھا اور دہائیوں نے بھی انگریزی سرکار کو سایہ و ہاب سمجھا قادیانی بھی انگریزی حکومت کو مسلمانوں کی حکومت پر ترجیح دیتے تھے اور دہائی بھی انگریزوں ہی کو مادی ملجا سمجھتے تھے قادیانیوں کی مربی بھی ہی ہمسند پار کی مخلوق تھی اور دہائیوں کے سرپرست بھی یہی گولے لوگ تھے

قادیانیوں کو بھی کسی دوسری اسلامی سلطنت میں جائے پناہ نہیں تھی اور دہائیوں کو بھی کوئی حکومت خوش آمدید کہنے کیلئے تیار نہیں تھی جناب ایوب قادری نے دہائیوں کی بابت بہت کچھ لکھا ہے مگر اصل بات لکھنے

سے شاید وہ بھی کتر اگے ہیں۔ اسوقت ہمارے پیش نظر بھی دو اقتصادی مسائل الجھاؤ حصہ اول ہے جو ۱۸۵۶ء میں لکھا گیا یوں تو اس کی ایک ایک سطر قابل دید بلکہ لائق عبرت ہے مگر ہم صرف ضرورت ایک دو حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ بیالوی صاحب لکھتے ہیں

مقصد ۱۸۵۶ء میں جو مسلمان شریک ہوئے تھے وہ سخت گنہگار اور بیکم قرآن و حدیث وہ مفسد و باغی بدکردار تھے۔ اکثر ان کے عوام کا لالچ تھا بعض جو خواص علماء کہلاتے تھے وہ اصل علوم دین و قرآن سے بے بہرہ تھے یا ناقص تھے کچھ باخبر اور سمجھدار علماء اس میں ہرگز شریک نہیں ہوئے اور نہ اس فتویٰ پر جو اس عذر کو جہاد بنانے کیلئے مفسد نے پھرتے تھے انہوں نے خوشی سے دستخط کئے اسکی تفصیل ہم اشاعت السنۃ والراجحہ میں کر چکے ہیں

یہی وجہ تھی کہ مولوی اسماعیل دہلوی جو حدیث و قرآن سے باخبر اور اس کے پابند تھے اپنے ملک ہندوستان میں انگریزوں سے جنکے امن و عہد میں رہتے تھے نہیں لڑے اور نہ اس ملک کی ریاستوں سے لڑے

(الاقصا فی مسائل الجھاؤ حصہ اول صفحہ ۵)

اے دروغ گوئی کی انتہا کہا جائے یا چالوئی کی حد آج تک مجاہدین آزادی ۱۸۵۶ء کے متعلق اتنی دل آزار باتیں شاید انگریزوں نے بھی نہ کہی ہوں جتنی ان خوشامدی لوگوں کی ہیں آزادی کے متوالوں، وطن کے پاسباؤں کو مفسد، گناہگار، باغی، بدکردار کہنا صرف انھیں لوگوں کو زیب دے سکتا ہے جنکے دلوں سے ایمان و غیرت کی آخری کرن بھی خارج ہو چکی ہو اور خواص علماء کرام کو علوم دین سے بے بہرہ اور نا سمجھ کہنا کمینگی کی انتہا ہے۔ بہر صورت

مولوی اسماعیل نے یہ اعلان دیدیا تھا کہ سرکار انگریزی پر نہ جہاد مذہبی طور پر واجب ہے نہ ہی اس سے محاممت ہے صرف ہم سکھوں سے اپنے بھائیوں کا انتقام لیتے ہیں یہی وجہ تھی کہ حکام انگلیش یہ کو بالکل خیر نہ ہوئی اور نہ انکی تیاری پر مانع ہوئے

(حیات طیبہ ص ۲۰)

اور یہی مزا حیرت چند صفحات کے بعد لکھتے ہیں

گورنمنٹ خوب جانتی ہے کہ اسکی سلطنت کی برکتوں کو فرقہ الہدیث نے کسی قدر تسلیم کیا ہے اور اسکی کیسے فرماں بردار اور مطیع اس گروہ کے لوگ ہیں (حیات طیبہ ص ۲۱)

جناب رئیس احمد جعفری تحریر فرماتے ہیں

مولوی نذیر حسین جو دہلی کے معتد اور پیشوا تھے انکے گھر میں تو ایک میم چھپی بیٹھی تھی (بہادر شاہ ظفر اور انکا عہد ص ۸۲)

اور جناب ایوب قادری لکھتے ہیں۔

مولوی میاں نذیر حسین ابن ہواد علی ... نے تو ایک طرف جہاد کے فتوے پر دستخط کئے اور دوسری طرف ایک انگریز مسٹر لیسن کو بھی پناہ دی (جنگ آزادی ۱۸۵۶ء صفحہ ۴)

اور پھر لکھتے ہیں مولوی نذیر حسین کو اس صلے میں ایک ہزار تین سو روپے نقد انعام ملا اس سلسلے میں ایک سرٹیفکیٹ میاں نذیر حسین کی سوانح عمری سے نقل کیا جاتا ہے

دہلی مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۸۵۶ء ڈبلیو جی واٹر فیلڈ قائم مقام کمشنر دہلی مولوی نذیر حسین اور انکے بیٹے شریف حسین اور انکے دوسرے گھروالے عذر کے زمانہ میں مسٹر لیسن کے جان بچانے میں ذریعہ ہوئے۔ حالت محرومی میں انہوں نے ان کا علاج کیا ساتھ تین مہینہ اپنے گھر میں رکھا اور بالآخر دہلی کے برٹش کیمپ میں ان کو پہنچا دیا

جنگ آزادی ۱۸۵۶ء بحوالہ الحیات بعد الممات

جناب ایوب قادری اس کتاب کے ص ۱۱ پر لکھتے ہیں

ان لوگوں کو اس خدمت کے صلے میں مبلغ دو سو اور چار سو روپے ملے تھے مبلغ سات سو روپے بابت تاوان منہدم کئے جانے مکانات کے ان لوگوں

کو عطا کئے گئے تھے۔ مسٹر لسن کی جان بچانے میں شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد بھی شامل تھے اور بقول افتخار عالم مارہروی اس انگریز خاتون کو وہی اٹھا کر لائے تھے۔

(جنگ آزادی ۱۸۵۷ء)

نتائج

ان احوال و واقعات کے پیش نظر کوئی بھی ذی فہم قاری حسب ذیل نتائج اخذ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

سید صاحب اور انکے مجاہدین کے تذکرہ لکھتے والے حضرات نے حقائق سے زیادہ عقیدت و اداوت سے کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ واقعاتی شواہد انکا ساتھ نہیں دیتے۔ سید صاحب اور مولوی محمد اسماعیل صاحب دہلوی کے تذکرہ نگار اس بات پر مصر و رعبند ہیں کہ صورت حال کچھ بھی کیوں نہ ہو وہ بہر حال انکی عظمت و شان بلند کرنیکی کوشش کرتے رہینگے۔

سید صاحب کے مورخ اس باب میں خود مضطرب ہیں کہ واقعہ شہادتیں لوگوں سے ہوا انگریزوں سے یا سکھوں سے۔ تاریخی حقائق انگریزوں سے جنگ کی نفی کرتے ہیں۔ اس باب میں کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ تاریخ میں انھیں کے موصوفین نے تحریف کی ہے۔ یعنی انگریزوں کے بجائے سکھ لکھ دیا گیا ہے مگر واقعات سکھوں ہی کے جنگ ثابت کرتے ہیں۔

مقصد جہاد میں حکومت الہیہ کا قیام ایک غلط پروگنڈہ ہے کیونکہ جناب مولانا مدنی اسے فرقہ وارانہ گورنمنٹ قرار دیتے ہوئے اس عظیم مقصد کی تردید کر رہے ہیں اور پھر یہ کہ خود مقصد جہاد میں اضطراب پایا جاتا ہے۔

گزشتہ شہادتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس جہاد میں انگریزوں نے سید صاحب کے بھرپور تعاون کیا تھا اور سید صاحب اور مولوی محمد اسماعیل صاحب اور انکے مجاہدین اپنے نہ ماننے والوں کو فنا کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ اور انہوں نے امامت و بیعت کی آڑ میں خونریزی کا جواز پیدا کیا تھا۔

سید صاحب کے مورخ بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ سید صاحب اور انکے مجاہدین فرنگی چال اور انکی سازش کا شکار ہو گئے تھے۔

اور یہ کہ دہلوی (المحدث) انگریزوں کے انتہائی مطیع و فرماں بردار تھے اور سرکاری انعام یافتہ لوگوں میں تھے۔

اور یہ کہ دہلوی انگریزی حکومت کو مسلمانوں کی حکومت سے بہر صورت اچھا جانتے تھے اور یہ کہ دہلویوں نے جہاد جیسے اہم فریضہ کو انگریزوں کیلئے منسوخ قرار دیا تھا۔

جنگ حریت ۱۸۵۷ء

حیرت انگیز باتیں

جنگ آزادی کا دور انتہائی بھیانک اور خوفناک دور تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے برصغیر کا چپہ چپہ لوہیں ڈوب گیا تھا۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ ہندوستان کی ہسکتی ہوئی شاداب سرزمین بارود کی ناگوار بو سے معمور ہو گئی تھی درناک چیخوں لڑنے خیز کر اہلوں، دگلدار آہلوں کیساتھ ہی حریت پسندوں، آزادی کے متوالوں کے پر جوش نعروں سے ارض و سما کی پنہائیاں بھر رہی تھیں۔ مجاہدین کی فائرنگ اور فرنگی توپوں کی گھن گرج سے دھرتی کا وسیع سینہ کانپ رہا تھا۔ ہر گلی، ہر کوچہ، ہر محلہ لاشوں سے بٹاپڑا تھا۔ بڑے بڑے کوئیں عصمت مآب لڑکیوں اور عورتوں کی لاشوں سے لرزے ہو گئے تھے۔ مردوں نے خود بھی اپنی بہنوں بیٹیوں اور بیویوں کی گردنیں کاٹ کر گولیوں سے پھلتی ہو گئے تھے۔ بڑا ہی دردناک دور تھا۔ جب دہلی ہی نہیں ہر قابل ذکر شہر کی ہر گلی میں پھانسیوں کے پھندے نظر آ رہے تھے۔ ہر محلہ میں درجنوں لاشیں اپنی بیکسی کا نام کر رہی تھیں۔

اس دور میں رونما ہونے والے احوال و واقعات اور اسکے اسباب و بلاعات پر نوز تحقیقات جاری ہیں۔ محققین الجھی ہوئی گتھیاں سمجھا رہے ہیں۔ اور بہت سی ایسی باتوں کا ظہور ہو رہا ہے۔ جسکا وہم و گمان بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جیسے جیسے ماضی کے دبیز پردے ہٹتے جاتے ہیں۔ بے شمار ان کہی کہانیاں جنم لیتی جا رہی ہیں۔

دور وہ مورخین حضرت (جن کی اکثریت اب بھی اُس مکتبہ فکر سے وابستہ ہے جسوں نے جہاد کو اختیار کر کے تاریخ کیساتھ نا انصافی کی ہے) اس بات میں سخت مضطرب نظر آتے ہیں۔ اس مکتبہ فکر کے مورخین حضرت فرماتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے علماء دیوبند اور اس سے متعلقین حضرات نے انگریزوں سے سخت جنگ پیکار کی انہوں نے مسدودوں سے (جدید مورخین کی رائے میں انگریزوں سے) نہایت خوفناک مقابلے کئے، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور اس راہ میں ظلم و ستم کے نشانے بنے۔ (مگر یہ حضرات انگریزوں کے باب میں دستاویزی ثبوت مہیا کرنے سے قاصر ہیں) اس کے ساتھ ہی سوانح نگار حضرت نے ایسی حیرت انگیز قلم کاریاں فرمائی ہیں۔ اور ایسی عجیب و غریب حکایات و روایات پیش کی ہیں کہ پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے مثلاً جناب ایوب قادری صاحب اپنی کتاب جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا یعقوب علی صاحب نانوتوی کی کتاب "سوانح عمری مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی مطبوعہ دیوبند" کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں۔

چند بار مسدودوں سے نوبت مقابلوں کی آگئی اللہ نے مولوی صاحب (محمد قاسم نانوتوی) ایسے ثابت قدم تلوار بردار تھے میں اور بند و قبیوں کا مقابلہ ایک بار گولی چلی رہی تھی کہ یکایک سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ جس نے دیکھا جانا گولی لگ گئی ایک بھائی دوڑ پڑے پوچھا کیا ہوا فرمایا سر میں گولی لگی۔ علامہ امار کر دیکھا تو کہیں گولی کا نشان تک نہیں ملا اور تعجب یہ ہے کہ خون سے کپڑے تر تھے انھیں دلوں ایک نے بندوق ماری جسکے سمجھے سے ایک مونچھ اور کچھ داڑھی جل گئی اور کچھ دہرے آنکھ کو نقصان پہنچا خدا جائے گولی کہاں گئی۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۸۲ تا ۸۷ ایوب قادری

اب ان حضرات کو کون بتائے کہ شیشے کے محل میں بیٹھ کر پتھر بازی کا شغل مناسب نہیں ہوتا۔ یہ روایت بدایت روایت کے خلاف ہے تلوار بمقابلہ بندوق تو خیر شاندار بات ہے ہی۔ مگر تعجب یہ ہے کہ سر میں لگنے والی گولی کہاں گئی۔ حالانکہ "مجاہد کبیر فرماتے ہیں کہ گولی سر میں لگی ہے۔ اور انتہائی حیرت ناک بات یہ ہے کہ سر میں گولی کا نشان تک نہیں ہے

اور اس سے بھی زیادہ خوفناک بات یہ تھی کہ کپڑے خون سے تر ہو رہے تھے۔ غالباً اس کو کرامت کہتے ہیں؟ یہاں اس موقع پر یہ کہا جائے کہ یہ ساری روایت ہی مولانا یعقوب علی صاحب کی کرامت ہے تو شاید کچھ نہ غلط نہ ہو۔

بہر صورت جب مورخین فرماتے ہیں کہ ان حضرات نے جہاد فرمایا تو ہمیں کیا انکار ہو سکتا ہے۔ ضرور جہاد فرمایا ہوگا۔ مگر حریت پسندوں، آزادی کے متوالوں سے اور یہی صحیح ہے۔ ویسے ہم تو اس بات کے بھی قائل ہیں کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں بہت سے ہندوں نے بھی حصہ لیا تھا اور ثابت قدم رہے تھے۔

مگر ان علمائے کرام کے سیرت نگار حضرت جو افسانے اور کہانیاں سناتے ہیں وہ یقیناً تعجب خیز اور محل نظر ہیں۔ اس باب میں تقریباً تمام داستان گو حضرات نے "تذکرہ الرشید مولانا عاشق الہی" کو ماخذ بنایا ہے۔ اور یہ تذکرہ ایسے افسانوں اور کہانیوں کا مجموعہ ہے جس میں اعتماد نہیں کیا جاسکتا (اور اس بے اعتمادی میں دور جدید کے مورخین بھی ہمارے ساتھ ہیں)۔

پھر یہ کہ سیرت نگار حضرت نے ان واقعات کو یکسر اور عداً نظر انداز کر دیا ہے جو انکے مقدمہ کی نفی کرتے تھے۔ البتہ مولانا مہر نے ایسا ہی ایک واقعہ کھڑا کر دیا ہے جو انکے مقدمہ کی نفی کرتے ہیں۔ مولانا مہر کی اس تاویل کو عقیدت مند لوگ ارادت کی بھونک میں قبول کر لیں مگر افسوس کہ ہر قاری اس سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔

مولانا عاشق الہی کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ حاجی احمد اللہ صاحب علیہ الرحمہ، مولانا رشید احمد صاحب مولانا محمد قاسم صاحب اور حافظ ضامن صاحب کا مقابلہ بندوق قبیوں میں ہو گیا۔

یہ نبرد آتما جھٹھا سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے والا باہٹ جانوالا نہ تھا اسلئے اٹل پہاڑ کی طرح پرجا کو ڈٹ گیا اور سر کا ڈجال نٹاری کیلئے تیار ہو گیا۔ اللہ نے شجاعت و جواہر دی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتا پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہو جائے۔ وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لئے جم غیر بندوق قبیوں کے سامنے ایسے جیسے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لئے ہیں۔ چنانچہ آپ پر خیر ہوئیں حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ زیر نفاٹ گولی کھا کر شہید ہو گئے (تذکرہ الرشید ص ۲۵۲) (۱۸۵۷ء کے مجاہد ص ۲۵۲)

مولانا مہر کی تاویل

چونکہ مولانا عاشق الہی کی اس عبارت پر یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ یہ پوری جماعت برٹش گورنمنٹ کی سپی خواہ تھی اور یہ مجاہدین کے بجائے سرکاری لوگ تھے۔ اور یہ کہ انگریزوں کی طرف سے حریت پسندوں سے بزدل آزمائشیں تھے۔ لہذا ضروری تھا کہ مولانا مہر حسب توقع اسکا دفاع کرتے۔ چنانچہ مولانا مہر تاویل فرماتے ہیں کہ

جماد اسرکار کے باغیوں کے الفاظ سے غلط فہمی پیدا ہو یہاں "سرکار" سے مراد خود حضرت حاجی صاحب ہیں اور مقابلہ ان لوگوں سے تھا جو انگریزوں کے طرفدار ہو کر آئے تھے لیکن سرکار کا لفظ ایسے طریقے پر استعمال کیا گیا کہ بظاہر اس سے حکومت مراد لی جاسکتی ہے۔

"تذکرہ الرشید" ایسے زمانہ اور ایسے حالات میں مرتب ہوئی تھی جب انگریزوں کا اقتدار اونچے کمال پر پہنچا ہوا تھا۔ اور نازک واقعات کی ترتیب میں مرموز طریقہ اسلوب سے کام لئے بغیر چارہ نہ تھا۔

یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ میری رائے اور میرا تاثر ہے اور میں اسے قطعی طور پر صحیح سمجھتا ہوں نہیں کہہ سکتا کہ مصنف مرحوم کے پیش نظر کیا بات تھی۔

اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد ص ۲۵۲ مولانا غلام دہل مہر

اس مقام پر مولانا مہر نے وکالت کا حق ادا کر دیا ہے اور لفظ "سرکار" کی بہترین تاویل فرمائی ہے اسکے علاوہ اس عبارت کی بظاہر اور کوئی تاویل ممکن بھی نہیں تھی۔ مگر اس تاویل سے جسے مولانا قطعی طور پر صحیح سمجھتے ہیں ان ٹھوس اعتراضات کی دیواریں نہیں گرائی جاسکیں جو اس راہ میں سد سکندری بنا کر کھڑی ہیں مثلاً یہ کہ

• انگریزوں کے دور کو مولوی محمد اسماعیل صاحب اور ان کے ساتھیوں نے عہد امن کہا ہے اور ان سے جہاد کو ناجائز قرار دیا ہے۔ اور یہ کہ انگریزی حکومت کو اپنی حکومت اور یہ کہ انگریزوں کی فتح کو اپنی فتح قرار دیا ہے۔

• اور یہ کہ ماضی میں سید احمد صاحب بریلوی اور ان کے ساتھی جہاد سے پہلے ان سے اجازت لیکر کوئی قدم اٹھایا کرتے تھے۔

• اور یہ کہ تاویلات میں ماہر ہونی کے باوجود علمائے دیوبند نے اس عبارت کی تاویل کرنیکی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔

• اور بڑی بات یہ ہے کہ مولانا مہر نے عمداً "تذکرہ الرشید" کی ان عبارتوں کو نظر انداز کر دیا ہے جو مولانا کی تاویل اور ان کے موقف کی نفی کرتی ہیں۔

اب آپ تسلسل کیساتھ "تذکرہ الرشید" اور "سولخ قاضی کی ان عبارات کو دیکھتے جائیں جو مہر صحت مولانا مہر کی تاویل سے مطابقت نہیں کرتیں۔ اور اس سے مولانا مہر اور ایوب قادری کا تسامح کھل کر سامنے آجانا ہے۔

لفظ مہر کا ر کے معنی

✓ شروع ۱۲۶۲ھ ۱۸۵۹ء وہ سال تھا جس میں حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ) پر اپنی سرکار سے باغی ہونیکا الزام لگایا گیا اور مفسدوں میں شریک ہونیکی تہمت باندھی گئی۔

تذکرہ الرشید ج اول ص ۶۲۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین متین کہ اس لفظ سرکار سے کون لوگ مراد لئے جاسکتے ہیں۔ اور کن مفسدین سے ملنے کی تہمت باندھی گئی تھی۔ اور کس سرکار سے باغی ہونیکا الزام لگایا گیا تھا۔

کیا یہاں بھی سرکار سے مراد حاجی امداد اللہ صاحب ہیں۔ اور کیا یہاں مفسدوں سے مراد انگریز یا ان کے ساتھی بن سکتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ یہاں سرکار سے مراد برٹش گورنمنٹ ہی ہے اور مفسدوں سے مراد لازماً صریحیت پسند ہیں۔ مولانا مہر کی تاویل اور انکی فراست کی قطعیت اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود نقہ و نظر کی کسوٹی پر صحیح ثابت نہیں ہوتی کیونکہ تذکرہ الرشید کی عبارت اس تاویل کا ساتھ نہیں دے رہی ہیں۔ مولوی عاشق الہی لکھتے ہیں

✓ جن کے سردوں پر موت کھیل رہی تھی انہوں نے کمپنی کے امن و عافیت کا زمانہ قدر کی نظر سے نہ دیکھا اور اپنی رحم دل گورنمنٹ کے سامنے بغاوت کا علم قائم کیا۔ فوجیں باغی ہوئیں۔ حاکم کی نافرمان بنیں قتل و قتال کا بند بازار

کھولا اور جو فردی کے غرہ میں اپنے پیروں پر خود کھڑیاں ماریں۔

(تذکرۃ الرشید ج ۱ اول ص ۱ طبع دارالعلوم دیوبند)

فساریے! یہاں کہنی سے کوئی کہنی مراد ہے۔ کیا یہاں بھی کہنی سے خدا خواستہ حضرت حاجی صاحب کی کہنی مراد لی جائیگی۔ اور ہم دل گورنمنٹ سے حضرت حاجی صاحب کی گورنمنٹ مراد ہوگی۔ اور فوجیں باغی ہوئیں سے حاجی صاحب کی فوجیں مراد لی جائیگی؟ ہمارا خیال ہے کہ مولانا مہر میں ایک ٹوٹ ہو نیکی باوجود مورخانہ فراخ دلی نہیں ہے اور ان میں بھی ضد کی وہ تمام خوبیاں یا خرابیاں موجود ہیں۔ جو اس طبقہ کے علماء کرام کا خاصہ ہیں ذرا یہ بھی دیکھتے چلیں۔

مولانا رشید احمد) سمجھے ہوئے تھے کہ جب میں حقیقت میں سرکارِ کافراں بردار ہوں تو جھوٹے الزام سے میرا بال بھی بیکار ہوگا اور اگر مارا بھی گیا تو سرکارِ مالک سے اسے اختیار ہے جو چاہے کرے۔

تذکرۃ الرشید جلد اول ص ۱

اگر تاویلات کے ذریعہ صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح ثابت کرنا مقصد ہے تو یہاں بھی تاویل فرمائیں۔ اس طرح کہ یہاں سرکار سے مراد ذاتِ رب العلمین ہے (کیونکہ ہم سب حقیقت میں اُسی کے فرماں بردار ہیں) اور یہ اس لئے کہ سرکار سے مراد یہاں حضرت حاجی صاحب بھی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ذاتِ باری کے علاوہ کوئی مالک ہے نہ مختار ہے۔ اور پھر جو چاہے کرے۔

نہ کوئی پردہ نہیں رہنے دیا۔ ع من اندازِ قدرتِ رومی شناسم

میاں محمد کی سننے سید میاں محمد صاحب "دناظم جمعیت علماء ہند" اپنی کتاب "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں ان واقعات کو ایک نئے انداز سے

ارشاد فرماتے ہیں۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ وغیرہ پر برطانوی حکومت نے فساد کا الزام لگایا اور ان بزرگوں نے اس سے انکار کر دیا۔ ان کا انکار بالکل صحیح تھا۔ کیونکہ انہوں نے فساد میں قطعاً حصہ نہیں لیا۔ البتہ فساد کی صورت ختم ہونے کے

بعد جب منظم جہاد کی شکل پیدا ہوئی تو اس جہاد میں ضرور بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جہاد فساد نہیں ہوتا بلکہ فساد ہوتا ہے

(علماء ہند کا شاندار ماضی ص ۲۹۵ جلد چہارم طبع المجمعۃ پریس دہلی)

کوئی شاندار ماضی کا مصنف ہے اور کوئی "روشن مستقبل کا" اور سب اپنی اپنی کہے جاتے ہیں اور تاویلات کا انبار لگا دیتے ہیں۔ مگر بات وہی سچ ہے جو آگے آرہی ہے، ایک بات سمجھ میں نہیں آتی جب یہ حضرات اتنے نڈر پر جوش، بیباک مجاہد تھے تو کسی مقام پر اقرار ہی کر لیتے کہ ہاں ہم نے انگریزوں سے جہاد کیا ہے۔ مگر ایسا نہیں کہا گیا مگر مریدین بہر صورت مجاہد بنا کر رہ گئے۔

بہر قادی کے ذہن میں اس سوال کا پیدا ہونا ضروری ہے کہ "جواز جہاد کی وہ جواب چاہئے کوئی منظم صورت تھی جسے بنیاد بنا کر انگریزوں سے جہاد فرمایا گیا۔ کیونکہ اسی علماء ہند کا شاندار ماضی کے مندرجات کے مطابق "اس زمانہ کی اصطلاح میں دہلی کا مطلب تھا پابند شریعت ص ۱۳۴ ج ۴" اور ہر سید کے قول کے مطابق حال یہ تھا کہ "مغول بادشاہ کو دلی کا بہت بڑا بدعتی سمجھتے تھے اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ دلی کی جن مسجدوں میں بادشاہ کا قبضہ داخل اور اسٹام ہے ان مسجدوں میں نماز درست نہیں چنانچہ وہ لوگ جامع مسجد میں نماز نہیں پڑھتے تھے (شاندار ماضی ج ۴ ص ۱۲۵) اور اسی کتاب کے ص ۱۲۴ پر اس سے بھی زیادہ وضاحت ہے "دلی میں دہلی مولویوں کا گروہ بہادر شاہ کو بڑا بدعتی جانتا تھا اور ان مسجدوں میں نماز پڑھنے کو جائز نہیں سمجھتا تھا جن میں بادشاہ کی طوط سے امام مقرر ہوتا اور ان کا اسٹام ہوتا ص ۱۲۴ ج ۴" پھر میاں محمد اپنی کتاب شاندار ماضی ج ۴ ص ۱۵۱ پر رقمطراز ہیں۔

بیشک آج (۱۸۵۷ء) سے تقریباً تیس سال پہلے انھیں علماء کی جماعت جن کو آج دہلی کہا جا رہا ہے حضرت مولانا اسماعیل شہید اور حضرت سید احمد شہید کی زیر قیادت ان ملکیت اور شاہنشاہیت سے دامن جھاڑ کر خلافتِ راشدہ کے نمونہ پر شمالی مغربی برہمنی علاقہ میں ایک حکومت قائم کر چکی تھی اور آج بھی انھیں علمائے کرام کا ایک دستہ مغل شاہنشاہیت اور برطانوی سامراج دونوں کے برخلاف علم جہاد بن کر نئی تیاریاں کر رہا تھا الخ (شاندار ماضی ص ۱۵۱ ج ۴)

تسل کیساتھ "زلزلہ" کی رد میں کتابیں لکھی جا رہی ہیں مگر بات بنی نظر نہیں آتی جسکی وجہ سے
یو کھلا بیٹیں عروج پر ہیں۔

ابھی حال ہی میں مولانا منظور احمد صاحب نعمانی کی زیر نگرانی جناب مولوی محمد عارف صاحب
سنبھلی استاذ ذندۃ العلماء لکھنؤ نے بھی ایک کتاب بنام "بریلوی فتنہ کا نیا روپ" رقم فرمائی
ہے جس میں قاتل اقل کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ جناب سنبھلی اپنی اس کتاب "بریلوی فتنہ کا
نیا روپ" کے صفحہ ۱۵ پر رقمطراز ہیں۔

اس زمانہ "یعنی ایم تحریک آزادی" میں مسلمانوں کے اندر کسی نیاز مند سرکار کا
تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہاں مولانا ارشد القادری کے اوپر والوں میں ایسے لوگ
اس وقت بھی پائے گئے ہوں تو ان کا اسے بعید نہ سمجھنا ٹھیک ہے۔ جناب
ارشد القادری صاحب میں کچھ ہوش، گوش ابھی باقی رہ گیا ہو تو ہم انھیں پڑھا
شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نصیحت یاد دلائیں کہ ہر جگہ گھوڑا دوڑا کر نہیں جاتی
نہ ہر جائے مرکب تو ان تاختم کہ جاہا سپر باید انداختن
وہ کہاں اس تاریخ جہاد بیکار کی باتوں میں اپنی ہنسی اڑوانے داخل ہو گئے
انکے لئے مذہبی فتنہ انگیزی اور گندم نمائی وجوہ فرشی کا میدان بہت ہے
(بریلوی فتنہ کا نیا روپ صفحہ ۱۵)

سنبھلی صاحب فرماتے ہیں کہ اس دور میں کسی نیاز مند سرکار کا تصور بھی نہیں کر سکتے حالانکہ
اس دور میں اتنے بڑے بڑے اونچے اونچے لوگ نیاز مند سرکار تھے کہ جنکا آج تصور بھی
نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے سنبھلی صاحب کی تاریخ دانی پر حیرت ہے۔ نرسید احمد خان کون تھے
شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد کون تھے شمس العلماء میاں نذیر حسین کون تھے وغیرہ وغیرہ بے شمار
خان بہادر اور شمس العلماء اہم کے لوگ اگر نیاز مند سرکار نہیں تھے تو یہ خطایات کسی صلے میں عطا ہو تھے
اس مبلغ علم پر سوانح قاسمی کے مندرجات کے مطابق اگر ان محرم کو مایخیو لیا کامر لیں کہدیا
جائے تو شاید کچھ غلط بات نہ ہوگی۔

اب انھیں کون بتائے کہ علامہ ارشد القادری کے اوپر ولے یہ ہے جاننا تو لوگ تھے

آپ ہی فیصلہ کریں کہ جو بادشاہ بدعتی تھا۔ حکومت موکیت تھی۔ اسکی زیر انتظام مسجدوں
میں نماز بھی درست نہیں تھی اور انکے تمام اکابرین اس سے بھی تیس سال پہلے دامن جھاڑ کر جا
چکے تھے۔ پھر وہاں خلافت راشدہ کا نمونہ بھی قائم کر لیا تھا۔ اور یہ کہ انگریزوں اور مغلوں دونوں
ہی کے خلاف علم جہاد بلند کر نواے تھے۔ کس طرح سلطنت دہلی کے زیر انتظام جہاد فرما سکتے تھے
لہذا یہ کہنا کہ حریت پسندوں کے طرف دار ہو کر انگریزوں سے جنگ کی سرسر غلط ہے بے بنیاد
اور غیر منطقی بات ہے۔ کیونکہ دہلی کی مرکزیت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اور بغیر مرکزیت کے
جہاد درست نہیں۔ اور دہلی کے علاوہ کوئی مرکزیت تھی نہیں پھر بڑھ پڑھ کر "کس طرح حصر لیا؟
اب سوانح قاسمی کا وہ حوالہ بھی ملاحظہ فرمائیں جس کے بعد
مالیخیو لیا کے مریض کسی تاویل کی گنجائش نہیں رہتی۔

اتنی بات بہر حال یقینی ہے اور ناقابل انکار چشم دید گواموں کا کھلا ہوا اقتضا
ہے کہ مالیخیو لیا سے زیادہ اس قسم کی افواہوں کی کوئی قیمت نہیں ہے کہ غدر
کے ہنگامہ کے برپا کرنے میں دوسروں کیساتھ سیدنا امام الکبیر مولانا محمد قاسم
نانوتوی اور آپکے علمی اور دینی رفقاء کے بھی ہاتھ تھے بلکہ واقعہ وہی ہے جو مصنف
نے لکھا ہے کہ مولانا فسادوں سے کوسوں دور تھے۔

(سوانح قاسمی جلد دوم صفحہ ۱۰۹ طبع دیوبند)

اس عبارت کا واضح مفہوم یہ ہے کہ جو یہ کہے کہ ان علما نے کلام نے انگریزوں سے جنگ
کی اور تحریک آزادی ۱۸۵۷ء میں انھوں نے کوئی کردار ادا کیا تو وہ مالیخیو لیا کامر لیں ہے۔
مولانا اور انکے رفقاء تو اس جنگ سے کوسوں دور تھے۔

زلزلہ کچھ عرصہ پہلے ہم نے حضرت علامہ ارشد القادری صاحب کی کتاب زلزلہ پڑھی تھی۔ بلکہ
اُسکے بعد واقعہ ہونے "دھماکہ" کا تجزیہ بھی کیا تھا۔ کوئی بھی قاری "زلزلہ" پڑھنے کے
بعد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسکی شائستگی اور جاذبیت سے اپنے اپنے دشمن بھی انکار
نہیں کر سکتے۔ مگر "زلزلہ" کے آتے ہی ان حضرات پر کچھ اس طرح زلزلہ طاری ہوا کہ الامان و
الحفیظ نتیجہ اس طبقہ کا ہر فرد "دھماکوں" کی نظر ہو کر رہ گیا ہے۔ اور پاک و ہند میں ایک

وہ انکے "امام ربانی" کی طرح تبیج دکھا دکھا کر تقیہ نہیں کرتے تھے۔ وہ انگریزوں کو آلہ جہاد تبیج کر مجاہد نہیں کہلاتے تھے۔ اور نہ ہی جہاد کے پہلے اور جہاد کے بعد انگریزوں کی دعوت اُڑایا کرتے تھے۔ اور نہ ہی انگریزوں کی عملداری کو اپنی عملداری اور انگریزوں کی فتح کو اپنی فتح و نصرت سمجھتے تھے۔ رہی جناب سنبھلی اور انکے رفقاء کی تاریخ دانی تو وہ بھی اس کتاب کے پڑھنے کے بعد ظاہر ہو جائے گی اور معلوم ہو جائیگا کہ انکی تاریخ دانی کا میاں کیا ہے۔

بہر صورت اس باب میں ہمارا مقصد یہ ہے کہ ان حضرات علمائے کرام نے (جن کی دھوم مچی ہوئی ہے) جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں کوئی مجاہدانہ کردار ادا نہیں کیا ہے۔ باقی یہ تو اکثر لوگ جانتے ہیں کہ یہ پیراں غمی پرند مریدان ہی پرانند۔

پر دہگندے کے بل بوتے پر کوئی مجاہد الکبیر بن جائے یا کچھ اور سب کچھ ہو سکتا ہے۔ چند اختلافات کے باوجود ہم یہاں اہل حدیث اہل قلم برق التوحید کی ایک تجزیہ نقل کرتے ہیں جو ان کے حقیقی خدو خال نمایاں کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

جماعت دیوبند ہر بہر اپنے سر سبائیکی آرزو مند ہے۔ (برق التوحید)

علمائے دیوبند کی ہمیشہ ایسی ہی دُرُخی اور منافقانہ پالیسی رہی ہے اور مستقبل کی تاریخ کے پیش نظر انہائے دیوبند نے ہمیشہ منافقانہ کردار ادا کیا۔ آپ حیران ہوں گے کہ اگر ایک طرف تحریک ریشمی و مال کا سہرا مجاہدین چمکتا اور عس سے چین کر مولانا سندھی ایسے اشتراکیت اور نام نہاد انقلابی کے سر پر تھوپا جاتا ہے تو دوسری طرف اسی خاندان دیوبند کے چشم و چراغ اور ایک حلقہ کے شیخ المشائخ کے بھائی انگریز کو خبری کرتے ہیں اور محمود الحسن کو گرفتار کروادیا جاتا ہے۔

تحریک پاکستان میں اگر ایک طرف شبیر عثمانی کا نام لیا جائے تو پاکستان کے تصور سے تعمیر و تکمیل تک کو علمائے دیوبند کی کوشش کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے تو دوسری طرف مدنی جیسے مردود اقبال بھی تھے۔ کہ اگر پاکستان نہ بنتا تاریخ فیصلہ انکے خلاف دیتی تو پھر بھی علماء دیوبند ہی کی کلمات کا منظر ہوتا۔

پھر دیکھئے ۱۹۵۲ء کو ایک تاریخ نے اسے سنہری الفاظ میں لکھا ہے تو محض دلیکا مجاہد کی برکات کا نتیجہ ہے۔ لیکن اگر تاریخ کا اونٹ دوسری کروٹ بیٹھتا تو احتشام الحق کا مذہبی، شفیق، ظفر احمد انصاری و عثمانی محمد حسن اور فیض محمد جالندھری جیسے قہم نبوت فروش علمائے دیوبند کا طرہ آپکو سب سے زیادہ بلند نظر آئیگا۔

اسکے بعد ۱۹۶۲ء کی تحریک قہم نبوت کی طوفان نظر دوڑائیے اگر مستقبل نے اسے حسین و درخشندہ تحریک قرار دیا تو کرڈٹ علمائے دیوبند کا نصیب مفروض ہوگا۔ کیونکہ بنوری کی بزرگی کا نتیجہ تھا۔ لیکن اگر وہ تحریک کوئی اور رخ اختیار کر لیتی تو اختتام تو پھر وہ تمہ بھڑات بھی فضلائے دیوبند ہی کو ملتا۔ کہ مولانا تھانوی اور ہزاروی اپنے پورے لاؤشکر سمیت بھٹو کی پشت پر تھے بالاختصار اسکے بعد آپ پاکستان کے میدان سیاست میں اتریں جسکی گہما گہمی تقریباً الوبی دور سے شروع ہوتی ہے چنانچہ اگر حالات کا فیصلہ الوب کے مخالفین کے حق میں ہوتا تو آپ کو ہی اہل دیوبند صف اول کے مجاہدین جمہوریت پسند نظر آئیگے۔ اور اگر حالات کا رخ دوسری طرف ہوتا تو اسی دیوبند کے خلافت راشدہ کے آخری درخشندہ ستارے سر تاج علمائے دیوبند احتشام الحق آپ کو الوب کا استقبال کرتے اور گلے میں ہار ڈالتے (بلکہ امام ضامن باندھتے) نظر آئیگے کہ یہ الوب ڈھکی اہل دیوبند ہی کا حصہ ہوگا اور یہ اسلئے بھی کہ حصول مفاد کی وقت تو مفتی محمود نے الوب کو اپنا دوٹ فروخت کر دیا۔ لیکن جب تحریک چلی تو جمہوریت کے سپروبن بیٹھے اور تاج محمود جیسے لوگ دیوان کی معرفت رات ہی رات میں اہل ثروت صاحب معراج اور اڈیٹر بولاک بنا کر دیوار الوب میں سجھو دیے ہوتے ہیں۔

آمد وقت بھٹو کی حکومت کا ذکر چلے تو آپ دیکھینگے کہ اگر بھٹو مخالفت کو تاریخ نے تریخ دی تو یہی انہائے دیوبند ہر اول دستہ ہوں گے لیکن اگر دوسرا پہلو روشن ہوا تو یہی خزانہ ان دیوبند عبدالحکیم، ضیاء القاسمی، تاج محمود، عبدالقادر آزاد، عبدالحق کوئٹہ، عبدالستار، عبدالحق اکوڑہ خٹک مولوی حسن شاہ ولایت دیوبند کے بے تاج بادشاہ غلام غوث بہاروی کی دست

۱۰۲
 باوجہ امتیاز و عیال و عیال چیلے چیلے نظر آئینگے۔ اور اگر کیڈٹ
 سرٹیفکیٹ انھیں ملیگا اگر بھٹو کے خلاف اسمبلی میں کارروائی کا کسی مورخ نے
 تذکرہ کیا تو مخالفت میں۔ یہی غلامان دیوبند کے بیت سے ایم ایم آپ کو ملینگے
 ۔ لیکن دوسرا رخ قابل انعام و اکرام ہوا تو۔ مستحق پھر بھی خدام دیوبند ہی ہوں گے
 شیخ الحدیث اکوڑہ خشک فرماتے ہیں (محترم اسپیکر صاحب میرا تعلق جمعیت علماء
 اسلام سے ہے ہمارے بزرگوں نے انتخاب کے موقع پر جتنی تائید بھٹو صاحب
 اور پیپلز پارٹی سے کی ہے اس سے اخبارات پر پریس قومی اسمبلی میں اسلام کا
 منہ کرے ص ۲۷)

یعنی اس موقع پر بھی دیوبند بزرگان کی بزرگی کے صدقے مستحق انعام ہونگے مشہور
 مسلمان نفاذ اور توحید پرست ادیب جناب ماسر القادری نے "قارن" میں
 خوبصورت اور لطیف پیرایہ میں فرمایا ہے۔ حضرت شیخ الحدیث اور ان کے
 بزرگوں کی اس شدید غلطی کو اللہ تعالیٰ انکی دوسری نیکیوں کے طفیل معاف کر دے
 اور اگر کسی مورخ کے نوک قلم پر مسئلہ پی پی پی سے اتحاد اور اختلاف کا آیا تو بصورت
 اول یہی دیوبند کے چشم و چراغ مفتی بھٹو سے ہنگامہ ہوتے نظر آئینگے اور بصورت
 ثانی بھی ضرب اختلاف کے پہلوان بھی یہی ہوں گے۔

اور اگر اس نام نہاد عوامی حکومت سے حصول مفاد کا مسئلہ درپیش ہوا تو ایک
 طرف آپکو مفتی صاحب وزارت علیا پر بھی کار سے مستغنی ملیگے۔ لہذا مستحق تشریف
 علماء دیوبند کی یہی سادگی ہوگی۔ کہ یہ رحمت ہے علمائے دیوبند کی دعاؤں کے
 صدقے۔ لیکن دوسری طرف کئی قاسمی آپ کو روٹ پر پٹ، پلاٹ ایجنسیاں
 لیتے بھی ملینگے کہ یہ رحمت ہے علمائے دیوبند کی دعاؤں کے صدقے۔
 اور اگر مستقبل میں بھٹو کی رہائی موضوع بحث نہی اور فیصلہ بھٹو کے خلاف گیا
 تو بہت سے فضلاء دیوبند آپ کو حاکم کی ستر کے قائل بھی نظر آئینگے۔
 لیکن اگر فیصلہ موافق ہوا اور اگر وہ رہا ہو گئے تو بھی علماء دیوبند کی کرامات کا

۱۰۳
 تقاضہ ہوگا۔ کیونکہ انھیں کئی حقوق حاصل ہیں جو بھٹو کی رہائی کا تقاضہ کھتے ہیں
 اور اگر ضیاء الحق کی مارشل لا کو تاریخ نے نظریہ ضرورت کے تحت صحیح قرار دیا تو
 بھی متعدد غلامان دیوبند آپ کو ضیاء حکومت سے تعاون کرتے ملیگے۔
 لیکن اگر مارشل لا درست نہ ہوا۔ اور اسکے خلاف جہاد ضروری ہوا تو بھی سب سے
 بڑے اور پہلے مجاہدین جمہوریت علمائے دیوبند ہی ہونگے کہ احترام اور ارشاد الحق
 تھانوی نے لاشعیاں کھائیں۔ اور گرفتاریاں پیش کیں۔

بہر حال اس مختصر سی داستان دلخراش کے پیش نظر آپ جب بھی دیکھیں اور جس
 طرف بھی دیکھیں تو آپ کو اس متضاد پالیسی کی گرہ نما ساریاں نظر آئیں گی۔ کہ یہ بھی علمائے
 دیوبند کی برکات ہے۔ وہ بھی اولیاء دیوبند کی کرامت۔ یہ بھی علماء دیوبند کی دعاؤں
 کا نتیجہ ہے۔ اور وہ بھی فضلاء دیوبند کی کوشش کا ثمرہ۔ یہ بھی علماء دیوبند کے
 علم و فضل کا کرشمہ اور وہ بھی خدام دیوبند کے ہند و فن کا منظر غرض کہ جدھر سے
 تمہارے کیڈٹ اور ایوارڈ آئے تو خاندان دیوبندی کا نام ہوگا۔ خواہ وہ ذلت و
 رسوائی کا ہو یا عزت و شرافت کا۔ گویا کہ حج جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے
 قادریں۔ شاید آپ سمجھیں کہ یہ تمام امور و واقعات حادثاتی یا اتفاقی ہیں۔ ہرگز ایسا نہیں
 بلکہ مبنی بر تہجد اور ایک سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ انیسائے
 دیوبند نے۔ ہر محاذ پر کس طرح محاذ آرائی شروع کر رکھی۔ مثلاً سیاست بازی جیتنے
 کیلئے جمعیت علمائے اسلام۔ مرزائیت پر فتح باب ہونے کیلئے تحفظ ختم نبوت
 حالانکہ کوئی وقت تھا کہ یہ تنظیم تمام مکاتیب تکبر کا ایک متفقہ مسئلہ کا نشان
 امتیاز و اتحاد تھا۔ لیکن اب دیوبندی نہیں بلکہ صرف تاج محمد لیمینڈ کا دوسرا نام
 ہے۔ لیکن اس سے محض نتائج بھی علمائے دیوبند کی کرامات ہی ہونگے۔ اہل تشیع
 کے مقابلہ میں تحفظ ناموس صحابہ کی تنظیم معرض وجود میں آئی کہ اگر کسی وقت اس
 مسئلے میں انعام وصول کر لیا تو موقع آیا تو ہمارے منہ کا پانی خشک نہ ہوگا۔ شرک
 و بدعت کے خلاف اڑھائی کئی جماعت "اشاعت التوحید والسنہ" ہے۔

تاکہ وقت آنے پر یہ ایوارڈ بھی ہمارے حصے میں آ سکے۔ تبلیغ وارشاد کیلئے تبلیغی جماعت اور مرکز چینیٹ کا ہتھیار استعمال ہوا۔ کہ اس میدان میں بھی کوئی موقعہ علمائے دیوبند کے ذریعہ پڑے اسلام کو اپنے نام و جبری کرانے کا ضائع نہ ہو پائے۔ اہل حدیث حضرات کے خلاف نفس و خود کو ناکافی تصور کرتے ہوئے "انجمن حزب الاحناف" بنائی کہ رضا خانیوں کی ہمدردیاں حاصل کر کے اہل حدیث سے مشاجرات کا کریڈٹ بھی کوئی اور نہ لیجانے پائے۔ اور بریلویت کے خلاف حماد آرائی کیلئے سواد اعظم کا عظیم فراڈ رچایا۔ کہ اہل حدیث کو استعمال کر کے بوقت انعام ہم حاضری دے سکیں اور بالفرض یہ تنظیمیں حصول منزل میں ناکام رہتی ہیں تو کریڈٹ لیتے پھر بھی آپکو علمائے دیوبند ہی تمام سے آگے نظر آئینگے کہیں مرزا قادیانی کی حمایت ہے۔ تو دوسری طرف ہاتھ کی صفائی کا کرتب اور اہل تشیع سے بھی مصالحت ہو سکتی ہے کہ شعوری اور غیر شعوری طور پر تو ہیں صحابہ میں یہ کوئی کم مقام تو نہیں رکھتے۔ اسی طرح عجمی مشرکین سے بھی دوستی ممکن ہے کہ مجاوران دین پور۔ خالقہ کنڈیاں، بھٹانہ بھون اسی بیماری کا تو علاج ہیں۔

(ہفت روزہ افق ۲۲ اپریل ۱۹۹۱ء / اپریل ۲۷ شمارہ، ص ۲)

یہ ہیں علمائے دیوبند کے اضطراب اور کردار بے قرار کی چند جھلکیاں جسے اہل حدیث مغر نگار "برق التوحیدی" نے نہایت جارحانہ انداز میں لکھا ہے۔

اگر ہم یہاں بخاری و مسلم سے دو حدیث لکھیں تو شاید بات بہت واضح ہو جائے۔

مَثَلُ الْمُنَافِقِ - منافق کی مثال۔

كَأَشَاطَةِ الْعَارِضِ بَيْنَ الْعُثْمَيْنِ لَعَبْرًا إِلَى هَذِهِ مَكَّةَ وَإِلَى هَذِهِ مَدَنَةٌ.

اُس بکری کی طرح ہے (جو بکرے کی تلاش میں) دو ریوڑوں کے درمیان بھرتی رہتی ہے اور وہ

يَجِدُونَ شَرَّ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ذَٰلِجُوهَيْنِ الذِّي نَافٍ هَٰذَا ذَرْدًا وَهَٰذَا

وَهُوَ لَا يُوْجِبُ (بخاری و مسلم)

(قیامت کے دن بدترین لوگ دو چہروں والے ہونگے یعنی منافق) ایک چہرے سے ان کی طرف اُٹینگے اور دوسرے چہرے سے دوسروں کی طرف)

اس باب میں جناب شورش مرحوم نے بڑے جارحانہ انداز میں کہا ہے

گاہ گنگا گاہ جمن پرمو کرنے لگے ہم انھیں عالم سمجھتے تھے مگر دجال ہیں
پیر و اشہد تھے کبھی انکے دل بھجھائی ٹیل اب بھی انکے ذہن میں پنڈت جیسے لال ہیں
حافظ اعظم کی شخصیت سے نفرت آج تک اس پر دعویٰ کر اپنے دوسرے لیل ہیں
پانی پت ڈھرم ڈھاری کلچر کی گنجی کیا تھ کیسے کیسے لوگ شورش صاحب اقبال ہیں

(ہفت روزہ چٹان، ۱۹۹۱ء)

تحریک خلافت

جنگ آزادی کے دوران برصغیر کے وسیع و فراخ سینے پر جو ہولناک اور لرزہ خیز خون کی کھیل کھیلا گیا۔ اسکا ذکر اتنا لرزہ خیز ہے کہ دل اور قلم دونوں ہتھکڑے ہیں۔ برصغیر کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی بے گور و کفن لاشیں مدتوں ظلم و ستم کی دردناک داستانیں سناتی رہیں۔ جلے ہوئے منہدم مکانات سے اٹھنے والے دھوئیں آہلوں کیساتھ نہ جانے کن بلند یوں میں کھو جاتے تھے۔ اور ایک طویل مدت گزر گئی کسی قابل ذکر انقلاب نے کروٹ نہیں لی

گویا پوری قوم سرسبز و دریا و سیول کی اتحاد تار کیوں میں گم ہو گئی تھی۔ یا بھڑکات کے بیکراں سمندر نے قوم کے جیالوں کو نگل لیا تھا۔ قائدین یا تو شہادت کی سبوت حاصل کر چکے تھے یا کابے پانی کے جہنم کدہ میں صبر و استقامت کیساتھ صبر تلوں کے دن گزار رہے تھے۔ اور جو باقی بچے تھے غفور و عافیت کی تلاش میں تھے۔

ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے عزت کے بجائے ذلت کو قبول کر لیا تھا انھیں آزادی سے زیادہ غلامی پر کشش نظر رہی تھی۔ دنیاوی وجاہت کی چاہت میں آخرت کی سعادت بھول گئے تھے۔ خطابات و نوازشات کی چکا چوند نے عزت ملی کو

پامالی کر دیا تھا۔ بہ صورت گورے حکمرانوں اور ان کے کالے غلاموں کے لگائے ہوئے زخم
بہمد کا دی تھے۔ سسکیوں اور ہچکیوں کے ختم ہونے میں ایک مدت گزر گئی۔

کچھ انجمنیں کچھ کمیٹیاں | اس دوران میں کئی انجمنیں اور کمیٹیاں وریوسی ایشن بنیں
(۱) برہم سوامی بنگال میں (۲) پراگھنا سماج مہاراشٹر میں
(۳) آریہ سماج پنجاب میں۔ (۴) تھیما سونیکل سوسائٹی مدراس میں۔

اسی طرح ۱۸۸۴ء میں اور اسکے قریب میں۔ مہاجن سبھا مدراس میں۔ سرو جانک
سبھا پورہ میں۔ انڈین ایوسی ایشن بنگال میں۔ بمبئی ایوسی ایشن بمبئی میں۔

اور پھر ۱۸۸۵ء میں آل انڈیا یونین بنی۔ اور اس کے سال بعد ہی ۱۸۸۶ء میں آل انڈیا
کانگریس بن گئی۔ جسے ایک انگریز مسٹر ہیوم نے قائم کیا۔ اسی طرح ۱۸۹۳ء میں گنگا دھ
تنگ نے ایک انجمن مخالفت دیوید کاؤ آرڈیننس ایوسی ایشن بنایا۔ اور اسی سال
۱۸۹۳ء میں جسٹس محمود نے ڈیفنس ایوسی ایشن قائم کیا۔ اور پھر اسی گنگا دھرتک

نے ۱۸۹۵ء میں سیوا جی فیشیول قائم کیا۔ مگر ان میں ایک آدمہ کے علاوہ تمام انجمنیوں یا کمیٹیوں
اور ایوسی ایشنوں کے قائم کرنے والے کٹر ہندو تھے۔ اور ان میں سے اکثر صراحتہ مسلمانوں
کے خلاف صف آرا تھے۔ ان ہندو تحریکیوں نے مسلمانوں کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ حالات
کی ناموافقت نے انھیں پامالی کر دیا۔ انھیں اتنے زخم آئے تھے کہ انکا شمار ممکن نہیں۔

سچ تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم
اور پھر انھیں زخموں کے دیکھتے گنتے پوری اُنیسویں صدی ختم ہو گئی۔ بالآخر بیسیویں
کا انقلاب آخری دور شروع ہو گیا۔

مسلم لیگ کا قیام | اگر اجازت ہو تو کہہ دوں کہ مجھ ہوتا ہے مجاہد پیمائے کارواں ہمارا
۱۹۰۶ء میں بمقام ڈھا کہ نواب سلیم اللہ خان۔ نواب دقار
ملک، اور مولانا محمد علی کی کوششوں سے مسلم لیگ قائم ہوئی مگر اُسے بھی ملک گیر حیثیت
حاصل کرنے میں سالہا سال لگ گئے۔ اور پھر انھیں ایام میں ایک الیادقت بھی آیا کہ پورے
برصغیر میں ریکات کا ایک عظیم طوفان برپا ہو گیا۔ مجاہدین نے ایک نئی کروٹ لی حریت پسند

ایک نئی شکل میں ظاہر ہوئے۔ دلی ہونی چنگا دیا بھڑکنے لگیں اور جذبہ جنوں آگے بڑھنے کو
مستعد ہو گیا۔

تحریک خلافت اور چند دوسری تحریکیں | ان میں ”تحریک خلافت“ تحریک ترک
مولات ”تحریک ہجرت اور تحریک ترک
زیم کاؤ۔ ہندو مسلم اتحاد۔ یعنی متحدہ قومیت کانفرہ مستانہ۔ اور بہت سی چھوٹی بڑی تحریکیں نے جنم
لیا۔ اور برصغیر کے وسیع و عریض سینے پر انڈٹ نقوش چھوڑ گئیں۔

چونکہ ہم کتاب کے موضوع کے اعتبار سے صرف انھیں تحریکات کا جائزہ لے سکتے ہیں
مسلم تحریک کہلاتی ہوں اور جن میں علما رحمٰن اور علمائے اہلسنت پر اعتراضات وارد کئے گئے
ہوں۔ لہذا پہلے تحریک خلافت!

تحریک خلافت کے بارے میں ابتدا ہی سے ہمارا نقطہ نظر بالکل واضح اور غیر مبہم رہا ہے
اور اس باب میں جو بات بے شمار شواہد کو سامنے رکھ کر قطعیت کیساتھ کہی جاسکتی ہے وہ یہ
ہے کہ نفس تحریک خلافت سے امام احمد رضا اور ان کے رفقاء کو قطعاً کوئی اختلاف نہیں تھا۔
البتہ اس تحریک خلافت کے طریقہ کار اور اس مذہبی، ملی، دینی اور اسلامی مسئلہ میں ہندو
سے اخوت و استعانت اور گاندھی جیسے اسلام دشمن کی قیادت و سیادت سے سخت اختلافات
پائیے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس دور میں امام احمد رضا کی مخالفت کی گئی اور انھیں نہ صرف یہ کہ
ایک خلافت کا دشمن قرار دیا گیا بلکہ انگریز دوستی کا الزام بھی چسپاں کیا گیا۔ (جسے کبھی ثابت
کرنے کی کوشش نہیں کی گئی)۔

مگر ابھی بہت دن نہیں گزرے تھے کہ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ سچی وہی تھا
امام احمد رضا اور ان کے رفقاء نے فرمایا تھا۔ جوش و جذبات کے دھماکے جیسے ہی تھے
ملائی و صداقت کا پرچم لہرا اٹھا۔ اور ہندوؤں سے مودت و رفاقت اور مشرکوں سے موافقت اور
استعانت کی قلمی کھل گئی اور جھوٹی اخوت کی سیاہ نقاب تازہ ہو گئی۔ ملمع اترتے ہی اند کا بھیانک
ظہار ہو گیا۔

اور عہد یہ ہے کہ یہ تحریک خلافت جسکے لئے چلائی گئی تھی اور جسکے لئے بے پناہ قربانیاں دی

گی تھیں۔ اور جنکے استقلال کیلئے سینے چھنی کر دئے گئے تھے، اور جن کی بقا کیلئے ماؤں نے اپنے بچوں کو بہنوں نے اپنے بھائیوں کو، بیویوں نے اپنے شوہروں کو قربان کر دیا تھا۔ ان کا انجام کچھ اچھا نہیں ہوا۔

مصطفیٰ کمال پاشا اور انکے ساتھیوں نے برسرِ اقتدار آتے ہی صرف خلافت ہی نہیں بے شمار شعائرِ اسلام کو بھی پامالی کر دیا اور سیکور (لادینی) حکومت کا اعلان کر دیا۔ مسجدوں میں تالے پڑ گئے۔ اذانیں بند ہو گئیں۔ اور بارہ ہفتہ کی نقابیں نوچ کر تذرا لٹش کر دیا گیا۔

۵ جولائی ۱۹۱۹ء کو ممبئی میں خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں آیا اور ۲۲ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں عظیم الشان

خلافت کانفرنس منعقد ہوئی۔ پروفیسر احمد سعید لکھتے ہیں کہ

جنگِ عظیم اول کے بعد ترکی کیساتھ انگریزوں نے جو سلوک کیا۔ اسکے پیش نظر مسلمانوں کیلئے اسکے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہ گیا تھا۔ کہ وہ ایک ملک گیر تحریک کا آغاز کریں۔ ادھر پنجاب میں جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آ گیا جس کی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد میں مدد ملی ہندو اور مسلمان دونوں انگریزوں کے خلاف متحد ہو کر کوئی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا چنانچہ ہندوستانی مسلمانوں نے مجلسِ خلافت کے نام سے ایک جماعت کی دہلی میں ۱۹۱۹ء کو مولوی فضل حق کے زیرِ صدارت ایک عظیم الشان خلافت کانفرنس منعقد ہوئی مولوی فضل حق نے اپنے خطبہ صدارت میں اس بات پر زور دیا کہ خلافت کے مسئلے میں غیر مسلموں کی مدد حاصل کی جائے خلافت کانفرنس کے اختتام پر مندرجہ ذیل قراردادیں پاس کی گئیں۔

۱۔ ایران اور ترکی کے مقدس مقامات میں جو ذیلیات کی گئی ہیں ان پر اظہارِ رنج کیلئے مسلمانانِ ہند جن صلح میں شریک نہ ہوں۔ اور اسکے خلاف جیسے منعقد کریں

۲۔ مسلمان حکومت سے ترکِ موالات کریں

۳۔ اگر حسبِ منشا ترکی کا فیصلہ نہ ہوا تو پھر ولایتی مال کا بائیکاٹ کیا جائے گا مذہبی نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور یہ اعلان کیا کہ خلافت کے مسئلہ پر وہ

مسلمانوں کا ساتھ دیا گا۔ گاندھی کی رائے میں ہندو مسلم اتحاد کا اس سے بہتر مدتی حوالہ میں بھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

(حصہ اول پاکستان ۱۲۵ پروفیسر احمد سعید)

اس عنوان کے تحت جنابِ یس احمد جعفری لکھتے ہیں

تحریکِ خلافت اور اس کا ردِ عمل

تحریکِ خلافت ایک ہولناک اور لرزہ خیز طوفان کی طرح ہندوستان کے سیاسی مطلع پر نمودار ہوئی تھی مسلمانوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ وہ سرے کفن باندھ کر میدانِ جہاد میں اتر چکے تھے۔ جیل جانا ایک کھیل بن گیا تھا۔ سینے پر گولیاں کھانا زور و زور کا واقعہ تھا۔ اس طوفان کا رخ جس نے موڑنا چاہا اسکی پگڑی سلامت نہ رہ سکی۔ یہ مسلمانوں کی موت و زیست کا مسئلہ بن گیا تھا انہوں نے طے کر لیا تھا کہ جو انکے ساتھ ہے ان کا دوست ہے اور جو ان کے ساتھ نہیں ہے وہ دشمن کے سوا کچھ نہیں ہے جسے انہوں نے اپنا مخالف سمجھا (غلط یا صحیح اس کی بحث نہیں) اس کا سیاسی وجود ختم کر دیا گیا۔ محمد علی جناح کو انہوں نے گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا۔ اکابر علماء و صلحا اختیار ابراہیم سے جس نے بھی اس تحریک کی مخالفت کی اسے مسلمانوں کے قومی پلیٹ فارم سے ہٹ جانا پڑا۔ تحریکِ خلافت کے مخالف مسلمانوں کی لاشیں تک پڑی رہتی تھیں لیکن قبرستان میں دفن نہیں ہو پاتی تھیں۔ انکی نماز جنازہ پڑھنے والا کوئی نہیں ملتا تھا۔ مخالفین کا سماجی مقاطعہ کیا جاتا تھا۔ اور انہیں مسلم محلوں میں رہنا دو بھر ہو جاتا تھا۔

ڈاکٹر کچو نے ہندوں کے سنگٹھن کے مقابلے میں مجلسِ تنظیم قائم کی اور مسلمانوں کی نظر سے اتر گئے خواجہ حسن نظامی نے شدھی کے مقابلے میں تبلیغِ کافرہ بلند کیا لیکن مسلمانوں نے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس سے تحریکِ خلافت کے کمزور ہونیکا اندیشہ تھا، ہندو اتحاد میں غلغلہ پڑنے کا اندیشہ تھا۔ کانگریس کی مرکزیت ختم ہونیکا دھڑکا تھا

اور مسلمان آزادی ہند کے نشہ میں، ہندو مسلم اتحاد کے جوش میں اتنے بے خبر ہیں جتنے کہ انہوں نے واقعات سے آنکھیں بند کر لی تھیں، حقائق سے منہ موڑ لیا تھا۔ کہیں ہندو مسلم اتحاد کا اہلیتہ پاش پاش نہ ہو جائے

(قائد اعظم محمد علی جناح اور انکا عہدہ شاہ ریش احمد جعفری)

جناب رئیس احمد جعفری مرحوم کی اس حقائق پر مبنی مفصل تحریر کے بعد یہ بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت برصغیر پاک و ہند کی کیا صورت حال ہوگی۔ اور علمائے حق علمائے اہلسنت کو کن المناک واقعات سے دوچار ہونا پڑا ہوگا۔ ان گھمبیر تاریکیوں میں اور خوفناک آندھیوں میں شمع صداقت کا روشن کرنا کتنا دشوار امر تھا۔ پھر بھی امام احمد رضا اور ان کے دلیر فقار پھر غجراتے رہے اور پرتور کرنیں اندھیروں کے سینے روشن کرتی رہیں

حسب ذیل اشعار پڑھ کر اس دور کی دیوانگی کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے

غریب قوم کے مردہ بدن میں جان ڈالی	لگاکے آپ نے ٹھوکر مہاتما گاندھی
عجب نہیں کہ یہ بیکند میں کریں لبسرام	کہ جیتے رہتے ہیں ہر ہر مہاتما گاندھی
ہیں امید ہے ہم کامیاب ہوں گے ضرور	کہ ہیں ہماری مدد پر مہاتما گاندھی

اور پھر دیکھئے کہ دل کی بیتاریکیاں کہاں تک پہنچ جاتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے

چل فخر قوم حضرت گاندھی کو دیکھ آئیں	جوش و خروش قوم کی آندھی کو دیکھ آئیں
اک دھوم مچ گئی سے سیما رہ آگئے	کرتے ہیں درد کا جو مداوہ آگئے
تقریب کوئی کر سکے ان کی بہ نادرست	خاموشی از شنائے تھو شنائے تست
مردہ بھی قوم آپ نے اسکو جلا دیا	ہم سب کو آب چشمہ حیواں پلا دیا

ایک اور استقبال شعر ملاحظہ فرمائیے۔

ہیں جنکو دیکھ کر ہر دمہ ششدر وہ آئے ہیں جھکاتے ہیں ملائک جنکے آگے سر وہ آئے ہیں

ماخوذ از تحریک آزادی ہند

اور غضب یہ ہے کہ یہ تمام اشعار ان مسلمانوں نے کہے ہیں جنکی مسلمانی اس دور میں تہی مست

ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کو کلمہ پڑھاتے پھرتے ہیں۔

غور طلب بات یہ ہے کہ اس قسم کے اشعار اور ایسے ہی عقائد و نظریات کی امام احمد رضا اور ان کے وفکار نے گرفت کی تو کوئی بری بات کی۔ کیا یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے کے باوجود انھیں خاموش رہنا چاہئے تھا؟ ہرگز نہیں انھوں نے گرفت کی اور بالکل صحیح گرفت کی اس پر امام احمد رضا کا مواخذہ کرنا سخت بددیانتی ہوگی۔

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دجائے جیسے حق نے کیا ہونیسان کے واسطے پیدا

قائد اعظم کی مایوسی | "تحریک خلافت" کے بارے میں جناب رضی حیدر لکھتے ہیں۔

محمد علی جناح کی زندگی میں ۱۹۳۱ء ایک نہایت اہم موڑ تھا جب وہ ہندوستان کی سیاست سے کسی حد تک دل برداشتہ ہو گئے تھے اب وہ صرف ایک سیاسی جماعت کے رکن تھے اور وہ بھی مسلم لیگ جو بعد میں محمد علی جناح اور برصغیر کے مسلمانوں کی تمناؤں اور آرزوں کا محور ثابت ہوئی۔ خود ہندوؤں کیلئے یہ بات بڑی تجسس کا باعث تھی کہ کل تک جسکو اتحاد کا بیجا ممبر اور امن کا نقیب کہاجاتا تھا وہ آج اس قدر وجہ تنقید کیوں بنا گیا ہے۔ لیکن جذبات کے تیز دھارے نے غور فکر کے لمحات عوام سے پھین لئے تھے چاروں طرف کانگرس اور خلافت کے مشترکہ موقف کی دھوم مچی

مسٹر گاندھی ذہین اور نفسیات النسانی کے بہت بڑے ماہر تھے انھیں مسئلہ خلافت اور مسلمانوں کے جذبات کا احساس تھا چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کیلئے مسئلہ خلافت کو صرف مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ سارے اہل ہند کا مسئلہ قرار دیا۔ مولانا محمد علی جوہر بھی اپنی تمام تر ذہانت اور فراست اور علم و فضل کے باوجود بنیادی طور پر جذباتی انسان تھے اور ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہئے کہ وہ مسٹر گاندھی کی چال کو نہ سمجھ سکے اور خلافت جیسی اسلامی تحریک کی باگ ڈور ایک کٹر ہندو کے ہاتھ میں دے بیٹھے ایسی صورت میں

محمد علی جناح کی آواز کو سننا وہ آئین اور قانونی اور سیاسی جدوجہد کی بات کر رہے تھے جبکہ گاندھی جی نے پورے ہندوستان کو گھراؤ اور جلاؤ کی نظر کر دیا تھا۔

(قائد اعظم کے بہتر سال ۱۹۴۷ء رضی حیدر)

یاد رہے کہ انھیں ایام میں محمد علی جناح کو بھی انگریزوں کا انجیٹ کہا گیا تھا اور انھیں دنوں نام احمد رضا پر بھی انگریز دوستی کا الزام تراشا گیا تھا جبکہ کوئی دستاویزی ثبوت آج تک فراہم نہیں کیا گیا۔ اور غضب یہ تھا کہ عین اسی زمانہ میں ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف وہ سب کچھ ہو رہا تھا جو اس دوستی، یکساں نگاہ اور بھائی چارہ کے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا عجیب دو غلا پن اور دور رخ تھی شرمی اور شنگھن کی تحریک بھی جاری تھی اور مسلمانوں سے اتحاد اور دوستی بھی مسلمانوں پر قاتلانہ حملے بھی ہو رہے تھے اور امن و آشتی کا پرچار بھی مسلمانوں کی بستیوں میں تاراج بھی کیا جا رہی تھیں اور اظہار الفت و پیار بھی۔ خوں آشام مہا بھائیوں کی کھلم کھلا حمایت بھی ہو رہی تھی اور مسلمانوں سے اخوت کا اقرار بھی۔

گاندھی کا حکم تقریباً ہر وہ شخص جو ذرا بھی تاریخ سے لگاؤ رکھتا ہے وہ گاندھی اور انکے ہم نواؤں سے بخوبی واقف ہے۔ چنانچہ جناب رضی حیدر لکھتے ہیں

خلافت کے مسئلے پر کانگریس اور خلافت کمیٹی کا اتحاد عمل میں آچکا تھا اس سلسلے میں گاندھی جی نے مسلمانوں کو گھیرنے اور انکی ہمدردیاں حاصل کرنے کیلئے بڑی عہدیت سے کام لیا جو کبھی بڑنا گاندھی جی کی فطرت نہایت بن چکی تھی وہ ایک تحریک کے نتائج سامنے نہیں آنے دیتے اور دوسری تحریک شروع کر دیتے جسکی بنا پر پہلی تحریک دم توڑ جاتی۔ ہندوستان واپسی کے بعد انکا مسلسل یہی دستور رہا چنانچہ انہوں نے خلافت کے مسئلے پر بھی اسی عہدیت کا مظاہرہ کیا۔

۱۳ جون ۱۹۲۰ء بنارس آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس نے خلافت کمیٹی پر زور دیا کہ وہ مجلس ترک موالات کے نام سے ایک انتظامیہ مجلس بنائے اور مفصل پروگرام تیار کر کے اس پر عمل درآمد کرانے (قائد اعظم کے بہتر سال ۱۹۵۷ء)

خلافت اور گاندھی جی کے سلسلے میں جناب گاندھی جی کی قیادت اور اس کا صلہ

قائد اعظم محمد علی جناح اور ان کا عہد میں بڑے دلچسپ اور عجیب و غریب حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔ جسکے دیکھنے کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کے بارے میں گاندھی جی کے کیا عزائم تھے اور اس جاننا تو ہم سے وہ کتنے مخلص تھے عنوان ہے "گاندھی جی کی قیادت"

علی برادران نے گاندھی جی کی قیادت قبول کر لی اور انھیں باپو تک کہنے لگے لیکن گاندھی جی نے مسلمانوں کے بل پر مہا تامل بننے کے بعد... مسلمانوں کیساتھ کیا کیا یہ رئیس الامرا مولانا محمد علی فروغ کی زبانی سنے۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۲۰ء پشاور کے ایک عظیم الشان اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے محمد علی نے کہا کانگریس کو انڈین نیشنل کانگریس فی الحقیقت مسلمانوں نے بنایا ہے۔ اس سے پہلے وہ عاقبت پسندوں کی تقریر کاہ تھی۔ مگر جس دن محمد علی شوکت علی اس میں شریک ہوئے اسی دن سے اس میں جان پڑ گئی چنانچہ کلکتہ کانگریس میں لالہ لاجپت رائے کی حفا کے باوجود کانگریس نے ترک موالات کو اپنا شعار بنایا۔

اور یہ حقیقت ہمیں بہت فخر کیساتھ یاد دہانی کی کہ سب سے جلیل القدر ہندو رہنما مہاتما گاندھی ہمیشہ خلافت کے سر رہا یہ سے دورہ کرتا رہا۔ ہماری قید کے بعد بھی مہاتما جی دورہ کے مصارف خلافت کے سر رہا یہ سے لئے حتیٰ کہ کانگریس کیلئے ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے کیلئے آپ کے دوروں کے مصارف بھی مجلس خلافت نے ادا کئے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کانگریس کی روح روانی تحریک خلافت اور مجلس خلافت تھی۔

قائد اعظم محمد علی جناح اور انکا عہدیت

یہ تھا گاندھی جی کی قیادت و سیادت کا مالی صلا اور خلوص و محبت کا گرا نقد رانعام جو انھوں نے مجلس خلافت سے بلا جھجک وصول کیا۔

دیوانگی کی انتہا

مجلس خلافت کے اغراض و مقاصد کی ایک شق یہ بھی تھی کہ خلافت کا تحفظ اور مقدس مقامات کی حفاظت و نگہداشت کی جائے۔ اس سلسلے میں سواد اعظم اہلسنت و جماعت پر الزام لگایا گیا تھا کہ یہ خلافت کے دشمن ہیں اور اکن مقدمہ کا تحفظ نہیں چاہتے۔ جس کے جواب میں تاج العلماء محمد عمر صاحب نعیمی علیہ الرحمہ نے السواد اعظم میں ایک مضمون تحریر فرمایا کہ۔

کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ دین اسلام کا حامی، مشریت کا پاسدار و سلطنت اسلامیہ اور اکن مقدمہ کا مخالفت سمجھا جائے اور وہ دہلیہ جتنے نزدیک یقیناً مشرک ہے اور فتنے بنانا جائز اور ڈھانا جائز۔ وہ اس کے حامی اور مددگار سمجھے جائے ہیں۔ گر گ لکھ کی چوپانی

(تحریک آزادی ہند و السواد الاعظم ص ۱۹۹)

مقابر اور مقامات مقدمہ کی پامالی کی کہانی جناب شورش کی زبانی ہم پہلے صفحات میں سنا آئے ہیں کیا یہ عجیب بات نہیں کہ جن لوگوں کے نزدیک ازواج مطہرات بنات النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کبار صحابہ کرام کے مزارات و مقابر و نذرناک کو بی بات نہیں تھی وہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ پر اعتراض کر رہے تھے۔

”تحریک خلافت“ اور ”تحریک ترک موالات“ وغیرہ کے اس ہنگامہ خیز دور میں جس کی ہلاکت آفرینی کا اندازہ گذشتہ صفحات کے مطالعہ سے آپ کو بخوبی ہو گیا ہو گا کہ حالات کتنی نازک صورت اختیار کر گئے تھے۔ اور سرکش جذبات مذہبی، ملی اغلاقی اور دیگر تمام حدود و قیود کو توڑ کر کہاں چاہیں گے تھے دیوانگی نے اسلام و کفر کے امتیازات مٹا ڈالے تھے

• جب کہ محبت و نفرت کی علامت گاندھی کی الفت و عداوت کو قرار دیا گیا تھا۔

• جبکہ گاندھی کی اطاعت لازمی اور ضروری سمجھی جاتی تھی۔

• جبکہ گاندھی کے سامنے ملائکہ کے سر جھکائے جاتے تھے۔

• جبکہ اسلام کے کٹر دشمن ہندوؤں کو ہادی و رہنما کہا جاتا تھا۔

• جبکہ اسلام کے خلاف افسانے رازدار اور دخیل ٹھہرایا جا رہا تھا !

• جب کہ مسلمانوں کی میت بے گور و کفن شرقی دہستی تھی اور ہندوؤں کی میت کو کا ندھا دیا جا رہا تھا۔

• جبکہ مسلمان رتھوں سے چورہو میں تھمرے ٹپتے رہتے تھے اور ہندوؤں کی دلجوئی کی جاتی تھی۔

• جبکہ ذوق اتحاد میں ہندوؤں کو برادران وطن کہہ کر سینوں سے لگایا جاتا تھا اور دینی بھائیوں کو نفرت سے دھتکار دیا جاتا تھا۔

• جبکہ اسلام دشمن ہندوؤں کو مسجد میں ٹمبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر چھا کر وعظ سنایا جاتا تھا اور مبغنین اسلام سے منہ پھیر لیا جاتا تھا۔

• جبکہ ایک عامی مسلمان ہی نہیں بڑے بڑے مسلمان شیخ الہند قسم کے لوگ ماتھے پر قشقہ لگانا فخر سمجھتے تھے۔

• جب کہ گاندھی جی اور گنڈو مانکے ساتھ ہی محمود الحسن کی بے پکاری جاتی تھی اور اس پر خوشی کا اظہار کیا جاتا تھا۔

• جب کہ مسلمان ہندوؤں کی لاشوں اور ان کے مردار جسم کو مر کھٹ تک پہنچانے کو اعزاز سمجھتے تھے اور مسلمان میت کا جنازہ بھی نہیں پڑھا جاتا تھا۔

• جب کہ کھد کے علاوہ کسی اور کپڑے کا کفن ہوتا۔ تو مولانا مدنی جنازہ بھی نہیں پڑھاتے تھے

• جب کہ قرآن خوانی اور بھی ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔

• جب کہ قربانی کی گایوں کو پھولوں کے ہار پہنا کر باجے، اکا جے اور ڈھول ڈھما کے کیساٹھ گٹھالہ پہنچا دیا جاتا تھا۔

• جب کہ قرآن و سنت کی طرف رہنمائی کرنے والے علماء و مشائخ کو انگریزوں کا ایجنٹ کہا جاتا تھا اور ان کی اہانت کی جاتی تھی۔

• جب کہ مشائخ عظام کی توہین و تذلیل اور پڑتوں کی تعظیم و توقیر کیا جاتی تھی۔

• جب کہ کی مولوی، مولانا، رہنمایان دین و ملت ”پنڈت جی“ کہلانے پر فخر محسوس کرتے تھے

• جبکہ قائد اعظم جیسی بھارت مند شخصیت اور مجدد اسلام کو خاموشی اور گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

دو عالم سے بیگانہ کرتی ہے دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی

انھیں اندوہیں اور دگر ایم میں امام احمد رضا اور انکی اولاد و احفاد اور انکے رفعا و منعا
بلا خوف خطر ان پھیلی ہوئی غوثی تاریکیوں میں امنڈتے ہوئے بلاخیز طوفانوں میں پوری جبرأت
کیساتھ نعرہ حق بلند کر رہے تھے۔ اسلام کے شیروں کی ڈھکالوں نے بڑے بڑے جفا داری
بیدروں کو پسپا کر دیا تھا۔

مگر امام احمد رضا اور انکے رفعا و متبعین کو شش ستم بنایا گیا اور انکے خلاف باقاعدہ فرد جرم تیار
کی گئی۔

- ۱۔ یہ کہ یہ لوگ حمایت سلطنت اسلامیہ کے خلاف ہیں۔
- ۲۔ یہ کہ یہ لوگ اماکن مقدمہ کی حفاظت ضروری نہیں جانتے۔
- ۳۔ یہ کہ امام احمد رضا دینی تال میں لفٹیننٹ گورنر سے ملاقات کی تھی۔
- ۴۔ یہ کہ گورنمنٹ کی خوشی کیلئے اسکے حسب منشا فتاویٰ دئے گئے۔
- ۵۔ یہ کہ گورنمنٹ سے اجرت اور تحوا میں پاتے تھے۔
- ۶۔ کانپور کے حنفی سنی علما و صوبہ متحدہ کے جلسہ میں باہر بلایا گیا مگر شرکت سے انکار کر
دیا۔ یاد رہے کہ یہ وہ دور تھا جب امام احمد رضا علیہ الرحمہ شدید بیمار تھے چنانچہ ۱۹۲۱ء
ہی میں آپ کا وصال ہو گیا۔ انھیں دنوں مولانا مختار احمد صاحب صدیقی علیہ الرحمہ نے
مذکورہ بالا سوالات کے جوابات طلب کئے اور آپ نے سخت ناتوانی کے باوجود
سلسلہ وار جوابات مرحمت فرمائے جو جہادی الاول ۱۳۲۹ھ میں شائع ہوئے۔
- ۷۔ سلطنت اسلامیہ اگرچہ بد عمل اور بد مذہب ہو بشرطیکہ اس کی بد مذہبی کو ترک نہ پہنچتی
ہو۔ جب کفار سے اسکی جنگ ہوگی مسلمانوں پر حسب استطاعت اسکی امداد فرض
ہے۔ استطاعت سے زیادہ نہیں۔
- ۸۔ اسی طرح اماکن مقدمہ اور جملہ شعائر اسلام کی حفاظت علی حسب الوسعہ فرض ہے۔
- ۹۔ اس کا جواب میرے پاس اس سے بہتر کیا ہے لَفُتْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَذِبِ

جس نے ایسا کیا ہواس پر قیامت تک اللہ جل جلالہ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور
اسکے نیک بندوں کی لعنت ہو۔

• ۱۰۔ مولوی نثار احمد صاحب جمیعت العلماء صوبہ متحدہ کی دعوت لیکر آئے۔ میں نے اسکے
مقاصد ہندوں سے اتحاد اور دیوبندیوں، وہابیوں کی شرکت و رکنیت وغیرہ بیان کئے
انہوں نے کہا ہم خالص اہلسنت کا جلسہ کرنے میں نے کہا کیجئے۔ میں خالص اہلسنت
کے ایک خدمت کار کی حیثیت سے اپنی تحریر بھیج دوں گا جلسہ میں پڑھی جائے کہ میں
بوجہ ضعف و علالت حاضری سے معذور ہوں۔

اس قسم کے جھوٹے الزامات کا مقصد صرف یہ تھا کہ ایک عبقری شخصیت کو عالم اسلام
میں ہمیشہ کیلئے بدنام کر دیا جائے اور امام احمد رضا کا مخالف طبقہ آج بھی اسی دگر پردوں
دوال ہے۔ اور تقریباً پون صدی گزر جانے کے باوجود اپنے الزامات پر ایک بھی دستاویزی
ثبوت پیش نہ کر سکے۔

خلافت اسکے آج پورا پورے ان لوگوں کی مدح سرائی پر کم بستہ ہے جن لوگوں نے واقعہ
بدائتہ انگریزوں کی ہمنوائی کی اور خطابات سے سرفراز کئے گئے۔ سید طفیل احمد منگھوری بیگ لکھتے ہیں

انگریزوں اور ترکوں کے درمیان ۱۸۸۲ء میں جب مصر کے بارہ میں بد مذہبی ہوئی تو
سر سید نے انگریزوں کی تائید کی اور انکی تحریک سے مولوی سمیع اللہ خان صاحب
جو علی گڑھ کالج قائم کرنے میں انکے دست راست تھے حکومت کی طرف سے مصر
بھیجے گئے اور انہوں نے مصری نوجوان کے خیالات انگریزوں کی طرف سے
درست کرنے میں اور سیاسی امور میں لارڈ کرڈ کا ہاتھ بٹانے میں نمایاں حصہ
لیا جسکے صلے میں انھیں سی ایم جی کا خطاب ملا۔

اسکے پندرہ سال بعد ۱۸۹۷ء ترکی اور یونان کی جنگ میں انگریزوں نے یونانیوں
کی حمایت کی تو مسلمانان ہند نے عام طور پر انگریزوں سے ناراضی کا اظہار کیا
اس وقت سر سید اور حاجی محمد اسماعیل صاحب رئیس علی گڑھ نے انگریزوں
کی حمایت میں مضامین کا ایک سلسلہ نکالا۔

۱۲۰ شرح کی طرح جسیں بزم گہ عالم میں خود جلس دیدہ اغیار کو بینا کر دیں

بندے ماترم | یہ مسلمانوں کیلئے ایک دل آزار نغمہ ہے، اسے کانگریس نے اپنا قومی ترانہ قرار دیا تھا۔ بہت عرصہ پہلے ایک انتہائی متعصب ہندو ادیب نے ایک ناول لکھا تھا "آئندہ مٹھو" (خوشیوں کا مندرائیں کامرکزی کردار یہ ڈاکوؤں اور لیٹروں کا ایک گروہ تھا۔ جو مسلمان حکمرانوں کے خلاف لوٹ مار اور دہشت انگیزی کرتا تھا۔ گویا زیریں ایک دہشت انگیز تنظیم تھی جو مسلمانوں کے خلاف سرگرم عمل تھی۔ جبکہ ترانہ (یا نغمہ) بندے ماترم تھا۔ وہ سب ڈاکو ملکر اپنی دھرتی مانا کو گویا سلام کرتے تھے۔ حصول آزادی کے بعد بھی کانگریس کا یہی قومی ترانہ باقی رہا اور اسی نغمہ سے ہر تقریب کی ابتدا ہوتی تھی۔ مگر جب کچھ مسلمان ممبران نے واک آؤٹ شروع کر دیا تو یہ نغمہ بند کر دیا گیا اس کے باوجود دیگر سرکاری تقریروں کا افتتاح اسی سے ہوتا۔

تعلیمی اداروں میں بھی یہی صورت حال تھی گاندھی کی تصویر کو سامنے رکھ کر پوجا کا انداز اختیار کیا جاتا اور بندے ماترم کا نغمہ گایا جاتا۔

پس یہ ہے کہ جب کسی قوم کی ملی غیرت روز و رات ہو تو اس سے ایسے ہی افعال سرزد ہوتے ہیں جیسا کہ "تحریک خلافت" اور متحدہ قومیت کے دور میں ہوا۔

قومی تشخص کی پامالی | اس باب میں ہم بہت سی باتیں پہلے لکھ آئے ہیں اور اب یہی کہانی پروفیسر احمد سعید صاحب کی زبان سنئے۔

احمد سعید صاحب اپنی کتاب "حصول پاکستان" میں "تحریک خلافت کے برکات" گناتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں

تحریک خلافت کی بدولت علماء اپنے حجروں سے نکل کر میدان سیاست میں آئے اور اس موقع پر انہوں نے اعلانیہ طور پر جھنڈا لیا اگرچہ اس کا نقصان بھی ہوا کہ نیم علماء نے بعض ایسی محرکات کیں جن سے اسلامی تصورات کو سخت نقصان پہنچا۔ ان میں سے بعض نے گاندھی کو شل بنی قرار دیا اور اس کے ہر قول کو قرآن و حدیث پر منطبق کر نیکی کوشش کی۔

(حصول پاکستان ص ۱۱۶)

کیا اسلامی تشخص کی پامالی اور ملی بے غیرتی کی اس سے بڑی مثال بھی مل سکتی ہے۔ ہر مسلمان اس سے یہ صحیح اندازہ لگا سکتا ہے کہ صرف مسلمان ہی نہیں اپنے آپ کو عالم دین کہلانے والے بھی اس نادر و انغولیں کہاں تک جا پہنچے تھے۔

دیئے پروفیسر احمد سعید صاحب نے نیم علماء لکھ کر اس کی اہمیت کو کم کر نیکی کوشش فرمائی ہے جس سے انکی اپنی تحقیقات مجروح ہوتی ہے۔ جناب پروفیسر صاحب نیم علماء لکھ دینے سے ان دردناک واقعات کی سنگینی ختم نہیں ہو سکتی۔

جنہیں محترم پروفیسر صاحب نے نیم علماء فرمایا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی استاذ الاساتذہ، مفتی زمان، شیخ الحدیث والقرآن، شیخ العرب والہم، اور شیخ الہند سے کم نہیں تھا۔ مولوی عبدالباری صاحب فرنگی علی کے متعلق آپ کی فرمائیں گے۔ مولانا محمود الحسن شیخ الہند کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہوگا۔ کیا یہ لوگ جو تنگ اور قسقہ لگا کر اپنے جیکائے سنتے اور جھومتے تھے نیم علماء تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی مفتی کفایت اللہ ابوالکلام آزاد کو آپ ناخواندہ کہتے؟

یہ لوگ تو بڑے اہل علم اور ہنرمند لوگ تھے مگر بات صرف اتنی تھی کہ دتر کہم فی ظلمت لایبصر دن

۱۲۱ پائے ماندن ہیں حاصل ہے زپاک رفتن جس طرف دیکھئے ثنات ہے خذیر کرے اور پھر یہ مسئلہ خلافت جس بھیانک انجام کو پہنچا اس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

دائے قے گشتہ تدبیر غیر
کار و تخریب خود تعمیر غیر

تحریک ترک موالات اور ہندو مسلم اتحاد

احوال و واقعات

واقعہ یہ ہے کہ ”تحریک خلافت“ نے اپنے مختصر دور میں جن خطرناک چیزوں کو جنم دیا ان میں ”تحریک ترک موالات“، ”تحریک ہجرت اور تحریک ہندو مسلم اتحاد“ جیسی خطرناک چیزیں بھی تھیں۔

تحریک کیا تھی ایک بھیاںک سیاہ طوفان تھا جس میں ہزاروں زلزلے اور لاکھوں بجلیاں لہرا رہی تھیں۔ اپنے پرانے کے امتیاز ختم ہو چکا تھا۔ صداقت کی حیات آفریں روشنی دھندلا کر رہ گئی تھی۔ طوفانوں کا رخ موڑ دینے والے جرأت مند لوگ کانگریس اور گاندھی کے دام فریب میں حالانکہ بنفسہ کانگریس خود کچھ نہیں تھی۔ یہ انگریزوں کے اشارے پر وجود میں آئی تھی اور انھیں کے کن گاتی تھی۔ یہ شب و روز حکمران طبقہ کے چشم ابرو کے اشارے کی منتظر باکرتی تھی۔ اور اس باب میں مسٹر گاندھی کی سیاست حکمران طبقہ سے ساز کرنے کے علاوہ کچھ نہیں تھی۔ اجموت رہنما ڈاکٹر اعلیٰ نے اسی دور میں کہا تھا کہ کانگریس کو حقیقتہً عظیم اور طاقتور بنانے والے ہندو نہیں بلکہ مسلمان تھے اور جناب مولانا محمد علی جوہر نے بھی پشاور کے عظیم الشان اجلاس میں یہی کہا تھا کہ ہم سے پہلے کانگریس عافیت پسندوں کی ایک جماعت تھی۔ مسلمانوں کے گرم لہونے اس میں جان ڈالی۔

جیسا کہ ہم اس سے پہلے لکھ آئے ہیں کہ بنارس کے اجلاس میں گاندھی جی نے مسلمان لیڈروں کو ہدایت کی تھی وہ فی الفور ترک موالات شروع کر دیں۔ چنانچہ

۶ دسمبر ۱۹۲۲ء کو جمعیت علماء ہند کا ایک غیر معمولی اجلاس منعقد ہوا اس میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک قرارداد پیش کی جس میں کہا گیا کہ چونکہ برطانیہ نے اپنے وعدوں کی کھلی خلاف ورزی کی ہے۔ اور خلافت کے اقتدار کو زائل کرنے اور خلیفہ المسلمین کی مذہبی طاقت کی تیج کنی کرنے میں اسلام کیسے صریح طور پر مذہبی تعصب کا ثبوت دیا ہے اس لئے مسلمانوں پر لازم آگیا ہے کہ وہ ان اعدائے اسلام سے ترک موالات کریں اسکے بعد باقاعدہ طور پر ترک موالات کا فتویٰ شائع ہوا جس میں

پانچ سو علماء کے دستخط تھے۔

(حصول پاکستان ۱۳۴۵ء)

اس ضمن میں جناب پروفیسر احمد سعید صاحب لکھتے ہیں۔

تحریک خلافت کو مؤثر بنانے کیلئے ترک موالات کا نسخہ ایجاد کیا گیا علماء نے باقاعدہ فتوے جاری کئے جن میں مندرجہ امور پر گورنمنٹ سے عدم تعاون کیلئے کہا گیا۔ حکومت کے انتظامی اور قانون کو نسوں سے عدم تعلق کا اعلان عدالتوں کا بائیکاٹ۔ ایسے اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ جنکو سرکاری امداد ملتی ہو۔ آزادی مجسٹریٹری اور اعزازی عہدے کا ترک کرنا۔ گورنمنٹ کے عطا کردہ خطابات کا واپس کرنا۔ گورنمنٹ کی ملازمتوں کو ترک کرنا۔

چنانچہ ہزاروں لوگوں نے اپنے خطابات واپس کر دیے۔ حکومت کی امداد سے چلنے والے اسکولوں اور کالجوں سے اپنے بچوں کو اٹھالیا گیا۔ ایسے نوجوان جو آگے چل کر حکومت کے بڑے بڑے عہدے پر فائز ہو سکتے تھے حکومت کی نوکری پر لات مار کر معمولی ملازمتوں کو ترجیح دی۔ طلبہ نے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا اور دینی تحریک میں کام کرنے لگے صرف کلکتہ میں تین ہزار طلباء نے اپنے کالج چھوڑ دیے۔ مسلمان اپنی نوکریوں کو چھوڑ کر ناقہ کرنے پر مجبور ہوئے لیکن یہ بات نہایت قابل ذکر ہے کہ ترک موالات اور عدم تعاون کی تحریک جو ہندو مسلم دونوں نے شروع کی تھی۔ یہاں بھی ہندوؤں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہ اٹھا رکھی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا اس بات کا فیصلہ کیا گیا تھا کہ حکومت کی امداد سے چلنے والے اداروں کا یا تو بائیکاٹ کیا جائے یا ان اداروں کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ سرکاری گرانٹ لینا مسترد کر دیں۔ چنانچہ مسلم زعماء نے علی گڑھ کالج کے منتظمین سے کہا کہ وہ سرکاری گرانٹ بند کر دیں۔ لیکن منتظمین کالج نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا بلکہ اس تحریک کی مذمت کی۔ جسکے نتیجے میں مولانا محمد علی جوہر اور کالج کے کرنا دھرتا حضرات میں سخت کشمکش کا آغاز ہوا۔ بالآخر مولانا محمد علی اور ان کے ساتھیوں

نے علی گڑھ کے بائیکاٹ کرنے اور جامعہ ملیہ قائم کرنیکا فیصلہ کیا۔ ایک تو علی گڑھ کالج میں اضطرابی کیفیت جاری تھی۔

ادھر بنارس یونیورسٹی میں بالکل سکون تھا جب بنارس یونیورسٹی سے بھی اس قسم کا مطالبہ کیا گیا تو مدین موہن مالویہ نے نہ صرف مولانا محمد علی جوہر بلکہ گاندھی جی کو بھی تقریر کرنیکی اجازت نہیں دی۔ گاندھی جی نے صرف یہ کہا کہ "مالویہ جی نہیں مانتے" ہندو یونیورسٹی کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچے دیا۔

(حصول پاکستان ۱۳۱۳ تا ۱۳۱۴ء)

ان حالات و واقعات کے پیش نظر یہاں صوف یہی کہا جاسکتا ہے کہ

ایک ہم ہیں کہ کیا اپنی ہی صورت کو نگار ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

اگر بات یہیں تک رہتی تو بھی عنیت تھی مگر یہاں "جمعیت العلماء ہند" نے جو پاکستان میں مشرور باسلام ہو کر "جمعیت العلماء اسلام بن گئی ہے

اور اب مارشل آئینی وجہ سے "نظام اسلام" کہلاتی ہے۔ شاید یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ دین و ملت شرم و غیرت سب کچھ گاندھی کے چرنوں میں ڈال کر دم لیگی۔

پروفیسر احمد سعید لکھتے ہیں۔

ہندوستان کی تمام تاریخ میں یہ دور پہلا اور آخری دور تھا جس میں ہندو مسلم اتحاد اپنے عروج پر تھا مگر اس زمانہ نے بہت کم عمر پائی۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی دلجوئی حاصل کرنیکی بہت کوشش کی مسلمان رضا کاروں نے رام لیلا کا بندوبست کیا، مندروں میں دعائیں مانگی گئیں، وید کو الہامی کتاب تسلیم کیا گیا، رامائن کی پوجا میں شرکت کی گئی۔ مسلمانوں نے اپنے ماقول پر تنک لگائے۔ لنگا پر پھول اور بتائے چڑھائے گئے۔

بار بار اس بات کا اعلان کیا جاتا کہ "گاندھی مستحق نبوت تھا، اور کہا گیا کہ اگر تجبوت ختم نہ ہوتی تو گاندھی نبی ہوتا۔ گائے کی قربانی کو موقوف کرنیکی تجاویز پیش کی گئیں۔ اور سب سے زیادہ غضب یہ کیا کہ دہلی کی جامع مسجد میں

ممبر رسول پر ایک متعصب ہندو شردھانند سے تقریر کروائی۔ اس شردھانند نے بعد میں مسلمانوں کو ہندو بنانکی "تحریک شادی کا آغاز کیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود ہندو ذہن میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔

(حصول پاکستان ۱۳۱۴ء)

کیا یہ وہی تاریخی حقائق نہیں جسے امام احمد رضا اور انکے رفقاء نے بیان کیا تھا جسکی وجہ متحدہ قومیت کے پروانے برا فروختہ نظر آتے تھے بلکہ اب تک ان نیک رجول کو صاف نہیں کیا۔

ہم پوچھتے ہیں کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے متحدہ قومیت کا نعہ لگایا۔ اور وہ کون لوگ تھے جنہوں نے شرکین سے بھائی چارہ کیا۔ ان کا خمیر کہاں سے اٹھا تھا اور آج انکی روایات کیا سوچ رہی ہے۔

عاب رضی حیدر لکھتے ہیں۔

۲۲ جون کو مسٹر گاندھی اور خلافت کمیٹی کے رہنماؤں نے ایک منشور جاری کیا جس میں اعلان کیا گیا کہ اگر سہی اگست ۱۹۲۰ء تک پیش کردہ مشترکہ شرائط تسلیم نہ کی گئیں تو ترک موالات شروع کر دیا جائیگا چنانچہ ۷ جولائی ۱۹۲۰ء گاندھی جی نے خلافت کانفرنس کی مجلس عدم تعاون کی طرف سے ترک موالات کے پہلے مرحلے کا اعلان کر دیا۔

(قائد اعظم کے بہتر سال رضی حیدر)

پھر اس کے ساتھ ہی جناب شیخ الہند محمود الحسن صاحب کا فتویٰ جاری ہو گیا۔ بھلا یہ کیسے تھا کہ جناب گاندھی گنگنائیں اور علمائے دیوبند کی بھانچہ نہ بنجے۔ سر میں سر ملانا ضروری سودہ مل گئی۔ جناب محمد حسین مدنی فرماتے ہیں

تحریک خلافت کا زور تھا، انگریزوں کی غداری سے لوگوں میں سخت برہمی تھی۔ ترک موالات کا زور تھا اس لئے چاہتے تھے کہ علی گڑھ یونیورسٹی برطانیہ سے ترک تعلق کرے مگر پرانے سرکار پرست ٹریشٹائن یونیورسٹی کب اسے

کو ادا کر سکتے تھے۔ انہوں نے سخت مخالفت کی جس کے نتیجے میں مولانا محمد علی مرحوم اور ان کے ہم خیال لوگوں کیساتھ یونیورسٹی کی ایک بڑی اور معتدبہ جماعت یونیورسٹی سے جدا ہو گئی۔ اور آزاد درسگاہ قائم کرنے کیلئے جس میں کوئی مداخلت حکومت برطانیہ کی نہ ہو۔

تیاری کرنے لگی یہ وہ زمانہ ہے جبکہ ناگپور میں اجلاس کانگریس ہوا تھا اور اسی زمانہ کو اپریشن کی تحریک پاس ہو چکی تھی اسکے خلاف مسٹر جناح اور ان کے موافقین کی رائے بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اور یہ پارٹی حدودِ برصغیر اقلیت میں آگئی تھی ملک کے تمام اہل الرائے ہندو اور مسلمان برطانیہ سے نہایت برگشتہ ہو رہے تھے۔ مہاتما گاندھی کی رائے قبولیت عامہ حاصل کر چکی تھی۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ترک موالات کے متعلق طلباء یونیورسٹی نے فتویٰ حاصل کر لیا تھا جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ترک موالات کی تمام دفعات میں کانگریس کی موافقت کی تھی۔ اور تمام مسلمان اور طلباء یونیورسٹی کو زور دار مشورہ تھا کہ وہ اس پر عمل کریں۔

گورنمنٹ سے قطع تعلق کریں اور تمام کالج اور اسکول گورنمنٹی امداد چھوڑ دیں اور کالجوں اور اسکولوں کے زعماء ایڈمنسٹریٹو تو طلباء ایسے کالجوں اور اسکولوں سے نکل آئیں۔ نیز ملازمان حکومت انگریزی ان ملازمتوں سے علیحدہ ہو جائیں جن میں حکومت کی امداد داخل طور پر ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ..... اس فتویٰ سے گورنمنٹ نے سر راجیم بخش صاحب کو خصوصی طور پر دوسری مرتبہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو سمجھانے اور فتویٰ کو واپس لینے کیلئے بھیجا تھا۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس فتویٰ ترک موالات پر اصرار کیا اور واپس نہیں لیا۔

جیسا کہ طلباء مسلم یونیورسٹی کے پاس ترک موالات کا مفصل فتویٰ بھیجا گیا تھا اس طرف خلافت کمیٹی کے کارکنوں نے بھی فتویٰ حاصل کیا اور وہ چھپ کر شائع ہوا (نقش حیات ص ۶۳)

اس باب میں جناب رضی حیدر لکھتے ہیں۔

ہندوستان میں تحریک خلافت کافی زور پکڑ گئی تھی اور اس میں شیخ مولانا محمود الحسن، مولانا عبدالباری فرنگی محل اور مولانا اشرف علی تھانوی جیسے علماء نہ صرف شامل ہو گئے تھے بلکہ ترک موالات، ذبیحہ گاؤں اور ہجرت کے موقع پر فتویٰ بھی حاصل کرنے لگے تھے۔ محمد علی جناح کا اس سلسلے میں موقف بڑا واضح تھا۔ اور وہ اس تحریک سے بالکل علیحدہ تھے۔

(قائد اعظم کے بہتر سال ص ۱۵۵)

ہلاکت خیز تحریک

جناب رئیس احمد جعفری نے اپنی کتاب "قائد اعظم محمد علی جناح اور ان کا عہد" میں یہی عنوان قائم کیا ہے اور فرماتے ہیں اپنی تقریر میں جناب جناح نے اس تحریک کو "ہلاکت خیز تحریک" قرار دیا تھا۔ ہندوؤں کیلئے تو یہ تحریک یقیناً ہلاکت خیز نہیں تھی

لیکن مسلمانوں کو اس سے ہلاکت تباہی اور بربادی اور دباؤ کے سوا کچھ نہ ملا

ہندوؤں کی بنارس یونیورسٹی برابر قائم رہی ایک دن کیلئے بھی وہاں سلسلہ تعلیم بند نہ ہوا اور مسلم یونیورسٹی لب کوہ ہو گئی۔ پھر ہجرت کی تحریک اٹھی تو اتھارہ ہزار مسلمان اپنا گھر بار، جائیداد اور اسبابِ غیر منقولہ اونے پونے بیچ کر (اسکے خریدنے والے زیادہ تر ہندو ہی تھے) افغانستان ہجرت کر گئے۔

وہاں جگہ ملی واپس آئے جو واپس آئے تباہ حال خستہ در ماندہ مفلس تلاشِ تہیدست۔ مینو ایے یار و مددگار۔ اگر اسے ہلاکت خیز نہیں کہتے تو کیا کہتے ہیں۔ اگر جناح نے اسے ہلاکت خیز قرار دیا تھا تو کیا غلط کہا تھا۔

(قائد اعظم محمد علی جناح اور ان کا عہد ص ۱۰۳)

محمد علی جناح اور محمد علی جوہر کی جھڑپ | حقیقت یہ ہے کہ اتنا پر آشوب اور جذباتی دور تھا کہ تحریک خلافت وغیرہ کے باب میں ایک لفظ بھی سننا گوارہ نہیں کیا جاتا تھا۔ جناب رضی حیدر قائد اعظم کے بہتر سال میں

چوہدری خلیق الزمان کی کتاب شاہراہ پاکستان کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

اس اجلاس میں مولانا محمد علی جوہر اور محمد علی جناح کے درمیان جھڑپ ہوئی اور مولانا محمد علی جوہر نے آپ کے خلاف تقریر کی۔ محمد علی جناح اسی دن شام کی گاڑی سے مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے بغیر بمبئی چلے گئے۔ بعد میں مسلم لیگ کا تیر ہواں سالانہ اجلاس ڈاکٹر مختار احمد کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں ترک موالات کی قرارداد منظور کر لی گئی۔ کیونکہ کانگریس کے اجلاس کی کامیابی کے بعد مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اس قرارداد کی مخالفت ناممکن ہو گئی تھی۔

(قائد اعظم کے بہتر سال ۱۹۴۶ء)

جھڑپ کی مزید تفصیلات

یہ واقعہ دسمبر ۱۹۴۶ء کے آخری عشرہ کا ہے۔ جب ناگپور میں مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کے بیک وقت اجلاس ہوئے تھے اور بہت بڑی تعداد میں لوگوں کی حاضری تھی اور یہ اختلاف ایک دستوری اور آئینی اختلاف کی بنا پر ہوا۔ اس اجلاس میں گاندھی جی نے جو قرارداد پیش کی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ انڈین نیشنل کانگریس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان عوام۔ تمام جائز اور پر امن طریقوں سے سول ریج حاصل کریں جبکہ اس سے پہلے کانگریس کیلئے یہ طے شدہ بات تھی کہ دستوری، آئینی طریقوں سے قومی اتحاد کے ذریعہ نظم و نسق میں اصلاح کرنا تھا۔ قائد اعظم نے فرمایا کہ میں اس قرارداد کی مخالفت کرتا ہوں۔

اور ابھی یہ پہلا ہی جملہ ادا کیا تھا کہ گاندھی اور خلافت کے شیعہ ایٹموں نے طوفان برپا کر دیا اور بد مزگی اپنی انتہا کو پہنچ گئی انھیں ایم میں قائد اعظم نے کانگریس سے استعفیٰ دیدیا۔ (بطور احتجاج) ایک با اصول انسان کو وہی کچھ کرنا چاہئے تھا جو انہوں نے کیا۔ جیسا کہ ذی حیدر لکھتے ہیں

ایک با اصول قانون دان کی حیثیت سے وہ ان قراردادوں کو گوارہ نہیں کر سکتے تھے جو کانگریس نے اس اجلاس میں منظور کی تھیں۔ وہ ہندوستان کے موقف کے سلسلے میں کسی احتجاج یا سخت اقدامات کے مخالف نہیں تھے۔ لیکن وہ

اس پروگرام پر یقین نہیں رکھتے تھے جسے کانگریس نے منظور کیا تھا۔

اس اجلاس میں انہوں نے مجمع کی جانب سے سخت مخالفت برداشت کی لیکن انھوں نے واضح الفاظ میں گاندھی سے کہا کہ تمہارا راستہ غلط ہے اور میرا راستہ صحیح ہے۔ کیونکہ آئینی اور قانونی طریقہ کار ہمیشہ درست ہوتا ہے۔

محمد علی جناح اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھے کہ ایسی تحریک کس طرح کامیاب ہو سکتی ہے جس میں ہر کول کو اسکول اور کالجوں سے اٹھا کر اور ان کا تعلیم سے نااطہ توڑ کر مظاہروں اور ہنگاموں کی راہ پر لگادیا جائے۔ مگر راستی اور نیک نیتی پر مبنی جناح کی بات نہیں سنی گئی۔ عوام اس بات پر تیار نہیں تھے کہ وہ کوئی منجیدہ بات سنیں۔

(قائد اعظم کے بہتر سال ۱۹۴۶ء)

اس کی کچھ تفصیل جناب رئیس احمد جعفری صاحب نے بھی بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ

گو گاندھی جی برقی کے موقع پر قائد اعظم سے ان امور کے متعلق سوال کئے گئے تھے جس کے جواب میں آپ نے تقریر فرمائی اور ۲۴ فروری ۱۹۴۶ء کے بمبئی کرائیکل میں شائع ہوئی۔ میرے بہت سے دوستوں اور رفیقوں نے پوچھا ہے کہ سیاست کے اس نازک ترین دور میں خاموش کیوں ہو۔ یا الگ تھلگ کیوں ہو بلاشبہ موجودہ صورت حال دشواریوں اور خطروں سے ہمراز ہے۔

ایک طرف حکومت کا وہ خود سرانہ اور سفاکانہ طرز عمل ہے جس نے وقار قومی کو مجروح کر رکھا ہے جس شخص میں ذرا بھی فہم سیاسی ہوگی وہ حکومت کو اس طرز عمل پر ملامت کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن دوسری طرف یہ کہنے سے بھی باز نہیں رہ سکتا کہ گاندھی جی نے جنکی میں عزت کرتا ہوں۔ جو پروگرام اختیار کیا ہے وہ قوم کو غلط راستے پر لئے جا رہا ہے۔

آوازیں۔ نہیں نہیں!۔ جناح میں جانتا ہوں آپ یہی کہیں گے لیکن میں آپ کے اتفاق نہیں کر سکتا۔ اگر یہ پروگرام قوم کو غلط راستے پر لئے جا رہا ہوتا۔

اور اگر مجھے یقین ہوتا کہ یہ صحیح پروگرام ہے تو میں پہلا شخص ہوتا جو اس کی عمل تائید کرتا میں گاندھی جی اور ان کے رفقاء کی عزت کرتا ہوں اور ان کے جذبہ قربانی کا معترف ہوں لیکن میں پھر یہ کہوں گا کہ انکا پروگرام قوم کو صراطِ مستقیم کے بجائے ایک گڑھے کی طرف لیجا رہا ہے۔

آوازیں نہیں بنیں!

اب گاندھی جی کے پروگرام کی دوسری شق لیجئے یہ ہے اسکول کا مقاطعہ میں پوچھتا ہوں آخر ترکِ تعلیم کا مقصد کیا ہے۔ کیا صرف چرخہ کا تنا۔ اگر یہی بات ہے اور گاندھی جی کہتے ہیں۔ یہی بات ہے تو میں کہوں گا کہ یہ تحریک سیاسی تحریک بہر حال نہیں ہے۔ گاندھی جی کے پروگرام کی تیسری شق ہے کھدر کا عام رواج۔ اس پر خود کانگریس کے دینی گیت بھی اس نہیں ہیں۔

اس طرح کامیابی نہیں ہو سکتی یہ سیاسی پروگرام نہیں ہے۔ جذباتی پروگرام ہے۔ (نائبِ اعظم محمد علی جناح اور انکارِ غرض ص ۶۹)۔

مولانا مدنی کا غلو یہاں ایک اور بات بھی دلچسپی سے غائب نہیں ہوگی کہ مولانا حسین احمد صاحب مدنی کھدر پوشی یا پھر گاندھی کی اتباع میں اتنا غلو فرماتے تھے کہ حیرت ہوتی ہے۔

جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب لکھتے ہیں کہ

سندھ کے فاضل جیل مولانا ہاشم جان مجددی رحمۃ اللہ علیہ راقم سے فرماتے تھے کہ مولوی حسین احمد مدنی سندھ آئے اور یہاں بھرے جموں میں صافے (عماسے پگڑی) اُتروا کر کھدر کی ٹوپیاں پہنوائیں۔

تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم ص ۱۲۴

فرمایئے کہ اگر وہ مدنی ہوتے تو مدینہ والے کی سنتِ عمامہ کو اُتروا کر گاندھی کیسپ وہ بھی کھدر کی نہ پہنواتے کھدر پوشی کے غلو کے متعلق ایک اور بات بھی سنتے چلیں۔ تحریک نظامِ مصطفیٰ کے دوران خاکسار کو بھی بہت سے لوگوں کیساتھ جیل جانا پڑا

تھا وہاں ایک مولوی صاحب سے خاصی گپ شیب رہتی تھی۔ مولوی صاحب جماعتِ اسلامی کے ضلعی خزانچی تھے اور بندہ جمعیتِ علمائے پاکستان ضلع بہاولنگر کا صدر دورانِ گفتگو وہ مولوی حسین احمد صاحب مدنی کی ردِ مدد سنانے لگے۔ جس میں یہ بھی فرمایا کہ مدنی صاحب ہمارے ہاں تشریف لائے رات کو سونے کیلئے جب تیار ہوئے تو کیا اٹھا کر پھینک دیا کہ اس کا غلات بدلیسی کپڑے کا تھا۔ اور اپنا کھدر کا کرتہ اُتار کر سر ہانے رکھ دیا۔ سبحان اللہ کیا سادگی و بے نیازی تھی۔ میں نے عرض کیا مولانا یہ کھدر پوشی۔ کس کی اتباع میں تھی۔ مدینہ والے کی یا گاندھی جی کی تو وہ منہ پھیر کر لیٹ گئے۔ اور میں سوچتا رہا۔

اس سادگی پر کون نہ مر جائے! لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

کھدر پوشی کی ایک اور کہانی حیرت ہوتی ہے کہ ان علما کرام کو کیا ہو گیا تھا۔ گاندھی کی اتباع میں اتنے زبردست غلو کا کسی نام مسلمان سے بھی تصور نہیں کیا جاسکتا چہ جائیکہ ”شیخ العرب والعجم“ کہلائیو اے مولانا مدنی سے اتنا غلو! تصورات کی دنیا میں تنہا برباد ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ لباس کے معاملہ میں سخت گاڑھا کھدر پہننے میں بہت مستند تھے اور ہمیشہ ساری عمر کھدر پہنتا اور اسکے علاوہ اور بھی اشیاءِ دسی استعمال کرتے تھے اور ملنے جلنے والوں سے بھی یہی پسند کرتے تھے کہ وہ دسی کپڑا پہنیں اور دسی اشیاء استعمال کریں۔۔۔ دسی لباس کے بارے میں اتنا اہتمام تھا کہ اگر کسی میت کو لٹھے وغیرہ کا کفن دیا جاتا تو اسکا جنازہ پڑھ کر تولیتے مگر پڑھاتے نہیں تھے۔

(بینش بڑے مسلمان ص ۶۴)

اب کیا عرض کیا جائے ”چھوٹا منہ بڑی بات“ ہو جائے گی اور معاملہ بھی ”شیخ العرب والعجم“ کا ہے ورنہ دریافت کیا جاسکتا ہے کہ وہ کاریں اور گاڑیاں کیا دیوبند یا دار دھاب میں تیار ہوتی تھیں جن پر لوے انڈیا کا دورہ ہوتا تھا۔ ہم تو اس وقت قائل ہوتے جب مولانا بیل گاڑی پر سوار ہوتے۔ اور گاندھی جی ہانکتے ہوتے۔

دہی بات لکھنے کی تو خود ہندوستان میں عمدہ لکھا تیار ہوتا تھا۔ وہ شاید ولایتی صرف اس لئے ہو گیا تھا کہ مشینیں غیر ملکی تھیں اور غور فرمائیے کہ مشینیں غیر ملک سے آنے کے بعد ہندوستانی نہ بن سکیں غیر ملکی ہی رہیں تو ٹانڈہ کے مولانا صاحب کچھ وقت مدینہ منورہ میں گزارنے کے بعد مدنی کس طرح ہو گئے۔؟ ہے تو ٹانڈہ ہی!

الحاصل قائد اعظم کو گاندھی کی قیادت و سیادت اور سیاست و وفات پر قطعاً اعتبار نہیں رہا تھا۔ وہ مخرب نہیں تعمیر کے خواہاں تھے وہ اس قسم کی تحریکات کو دوام و ملت کیلئے ہلاکت خیز اور تباہ کن تصور فرماتے تھے۔

علامہ اقبال اور ترک موالات گذشتہ صفحات میں یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ قائد اعظم محمد علی جناح نہ تو گاندھی کی قیادت پر اعتماد فرماتے تھے نہ ہی ان کی سیاست پر اور نہ ہی وہ ان جذباتی تحریکوں پر یقین رکھتے تھے جو گاندھی اور ان کے چلا رہے تھے۔

حضرت علامہ اقبال کو ان معاملات میں سخت گھبر اور کاسمانا کرنا پڑا تھا۔ ان کے معاملہ میں کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ وہ ترک موالات کے حامی تھے مگر حالات و واقعات اس بات کی نفی کرتے ہیں ہم یہاں جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب کا قابل قدر تجزیہ پیش کرتے ہیں جس حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ آپ لکھتے ہیں

علامہ اقبال بھی ترک موالات کے خلاف تھے۔ تحریک کے زمانہ میں وہ انجمن حمایت اسلام کے (لاہور) کے جنرل سکریٹری تھے ترک موالات کے مسئلے پر جنرل کونسل کی یہ رائے تھی کہ کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے پہلے علامہ کی رائے معلوم کی جائے علامہ اقبال اس کے موید تھے غالباً انھیں کے ایما پر مولوی حاکم علی (پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور) نے مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی علیہ الرحمہ سے ایک فتویٰ حاصل کیا۔ اور جنرل کونسل کے ایک اجلاس میں پیش کیا۔ اس فتویٰ کی روشنی میں جنرل کونسل نے ترک موالات کے خلاف فیصلہ صادر کیا۔ اس پر ایک طوفان برپا ہوا۔

۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء میں انجمن حمایت اسلام کے اجلاس میں علی برادران اور مولانا آزاد نے ترک موالات کی حمایت میں تقریر کی جب کہ علامہ کے دوست صدر انجمن سر شیخ عبدالقادر نے اس کے خلاف تقریر کی۔ علامہ نے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے رپورٹ پیش کی اور یہ محتاط اظہار خیال فرمایا

میں ہمیشہ ہر معاملے کو مذہبی نقطہ نظر سے دیکھتا ہوں اور جب تک کسی امر میں پورا پورا غور و غوض نہیں کر لیتا قطعی رائے قائم نہیں کرتا۔ میں مسلمانوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ آج شریعت کے احکام پر نہ چلے تو ہندوستان میں ان کی حیثیت اسلامی نقطہ نظر سے بالکل تباہ ہو جائے گی۔

(تحریر آزادی ہند اور السواد الاعظم ص ۱۱۹)

گاندھی جی کی درگت جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اس دور میں حالات اتنے سنگین تھے کہ علامہ اقبال خاموش تھے اور قائد اعظم جیسی عظیم و با وقار شخصیت جنکی فہم و فراست جنکی ذکاوت و ذہانت اور جن کی حق گوئی و جرات کے معترف ہندوستان انگریز پارسی سمجھی تھے مگر ترک موالات کے سلسلے میں ان کی بات سننے کے روا دار نہیں تھے۔ ان ناساعد اور دل شکن حالات میں امام احمد رضا علیہ الرحمہ اور ان کے رفقاء کے شیرازہ گرج سے بڑھ کر چپ چاپ بٹھرا ہوا تھا اور ان کی انکی شرعی و سیاسی بصیرت و بصارت نے طغیانی و سرکش کے اس عالم میں تہلکہ مچا دیا تھا۔

ترک موالات امام احمد رضا کے سلسلے میں اگرچہ اس دور میں کچھ کام ہوا ہے خصوصاً پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب نے مختلف مقامات فاضلانہ انداز میں ان مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور دور جدید کے بیکے ہوئے ذہن کو دعوت فکر و نظری ہے۔ پھر بھی بے شمار ایسی باتیں ہیں جو کہی جاسکتی ہیں اور بہت سے ایسے ایسے ہیں جو نازل پہنچا سکتے ہیں اور بہت سے ایسے موضوعات ہیں جن پر لکھا جاسکتا ہے۔ پھر بھی تشنگی قائم رہے گی۔

حاصل یہ کہ اس مسموم اور تہریلے دور میں جو ملی خدمات امام احمد رضا اور ان کے رفقاء نے کار انجام دی ہیں اور جس پامردی و استقلال سے انہوں نے گاندھی کی اور بھی سیاست اور اس کے

ہندوؤں کی اندھی رفاقت کا مقابلہ کیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔

حق یہ ہے کہ یہ صاف ستھرے لوگ تھے اور صاف ستھری سیاست پر یقین رکھتے تھے تملک، چاچلوسی ذاتی منفعت، دنیا داروں کی دنیاوی وجاہت اور غلط کاروں کی کثرت انھیں حق گوئی سے نہیں روک سکتی تھی انہوں نے جو کہا قرآن و سنت کی روشنی میں کہا اور برملا کہا، بھیریل کی غزٹیں اور اڑدھول کی پھیکاریں انھیں صراطِ مستقیم سے نہ ہٹا سکیں۔
جناب رضی جید رکھتے ہیں۔

بہار میں مولانا محمد علی مونگیری کی شخصیت بڑی پراثر تھی اور آپ نے وہاں ترک موالات کے سلسلے میں مخالفت کا بڑا طوفان اٹھا رکھا تھا۔ تحریکِ خلافت کا ایک وفد جس میں علی برادران، گاندھی جی حکیم اجمل خاں اور دیگر رہنما شامل تھے مولانا سے ملاقات کیلئے مونگیر پہنچا۔

وفد کے ہمراہ گاندھی جی بھی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں انحضرت اور قرآنِ کریم سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ مولانا مونگیری گاندھی جی کی ان باتوں کو خاموشی سے سنتے رہے۔ اور جب گاندھی جی اپنی بات مکمل کر چکے تو مولانا نے فرمایا کہ مجھے آپ اسلام کی وہ بات بنائیے جو آپ کو پسند نہیں آئی اور آلِ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے اُس کمزور پہلو سے آگاہ کیجئے جس آپ نے اچھا نہیں سمجھا۔ گاندھی جی اس سوال کیلئے تیار نہیں تھے کچھ چونکے اور فوراً بولے۔ ایسا کوئی پہلو میری نظر میں نہیں آیا۔ اس پر مولانا نے سوال کیا۔ تو پھر آپ ابھی تک سلام قبول کیوں نہیں کیا۔ گاندھی جی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ مولانا تھا ہر گئے اور فرمایا کہ آپ نے جو کچھ کہا غلط ہے آپ ہمیں صحت چنانچا چاہتے ہیں، رہا بھی ہندوؤں کو پکڑنے کیلئے انھیں کی بولیاں بولا کرتا،
قائد اعظم کے بہتر سال ۱۹۴۲ء

مشائخ عظام، علمائے کرام
بے اعتنائی کے اس دور میں خال خال ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے صداقت کا راستہ اختیار کیا اور حتی الامکان

جانبداری سے پہلو تہی کی۔ پورے عالم اسلام میں عموماً اور برصغیر میں خصوصاً مشائخ عظام اور علمائے کرام کے کارنامے و کردار سید درخشندہ و تابندہ ہیں۔ تاریخ کا ہر دور انکی بہترین کارکردگی سے تابناک نظر آتا ہے مگر اسے بد قسمتی کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ انھیں ہمیشہ صفحاتِ تاریخ سے نکال باہر کیا گیا۔ اور انکے درخشندہ کردار سے چشم پوشی کی گئی
جناب رضی جید رآن مومنین میں سے ایک ہیں جنہوں نے حق گوئی کی طرف توجہ فرمائی آپ لکھتے ہیں۔

برصغیر میں علماء کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو اس مصلحت آمیز ماحول میں تفسیر قرآن از قرآن کے اصول پر گامزن تھا اس لئے ہندوؤں سے اس قدر میل جول کو اور تعاون کی سخت مخالفت کی۔ پنجاب میں سید مہر علی شاہ صاحب گوردہ شریف متحدہ صوبجات میں اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی اور بہار میں مولانا محمد علی مونگیری نے اس سلسلے میں کھل کر آواز بند کی۔

پیر سید مہر علی شاہ صاحب گوردہ شریف، ترکی سلطنت کو اسلامی خلافت کا درجہ نہیں دیتے تھے لیکن ان کی مکمل ہمدردی اس وقت تک ترکوں کیساتھ رہی جب تک مصطفیٰ پاشاہ کی انقلاب پسند جماعت نے برسرِ اقتدار آکر اس بات کا اعلان نہ کر دیا کہ ”ہماری حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہے“

پیر صاحب نے جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں گھر کے زیورات اور اصبطل کے گھوڑے تک فروخت کر کے ترکوں کی امداد کیلئے چنڈہ دیا۔ حتیٰ کہ تحریکِ خلافت کے دنوں میں بھی اپنے اُن غلین کو جو اس میں عملی طور سے حصہ لے رہے تھے منع فرمایا۔ لیکن جب استفسار کیا گیا کہ مسلمانوں کیلئے گاندھی کے احکامات کے تحت چلنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ تو آپ نے اسے ناجائز قرار دیا۔ آپ نے ہندوؤں سے موالات جو ان سے انکار فرمایا۔ اور کہا کہ ترک موالات، ہندو انگریز یہود سب ہونا چاہئے۔ کھدو کے استعمال کو تسلیم نہیں کیا۔ اور ذبیحہ گاو کی قیامت کو رد کیا
(قائد اعظم کے بہتر سال ۱۹۴۲ء)

رُزِیَاؤں کے دلِ حَسَنِ دِلِ جَائیں وَہ طَوَّافانِ
اس باب میں کچھ لکھنے سے پہلے یہ عرض کرتا چلوں ترک موالات

”تحریک ہجرت“ ہندو مسلم اتحاد“ ”ترک ذبیحہ گاو“ کے سلسلے میں ”امام احمد رضا علیہ الرحمہ“ کی کتاب ”المنجیۃ المومنین“ کا بغور مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔ جواب رسائل رضویہ جلد دوم میں مکمل آچکی ہے۔

امام احمد رضا علیہ الرحمہ اور تحریک ترک موالات کے متعلق جناب رضی حیدر فرماتے ہیں۔

فاضل بریلوی اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں سے ترک موالات کے سلسلے میں لاہور اور لائپزگ سے ایک بادیگرے دو استفتاء کئے گئے جنکا آپ نے مکمل جواب دیا۔ اس کو ایک رسالہ کی شکل میں جو انہی صفحات پر مشتمل ہے مطبع حسنی پریس بریلی نے ۱۹۲۰ء میں شائع کیا۔ اس جواب میں جو فتویٰ کی صورت میں ہے فاضل بریلوی نے ترک موالات کے مذہبی تاریخی اور سیاسی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد اُن اقتصادی نقصانات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جو ترک موالات کے نتیجہ میں مسلمانوں کو پہنچنے کا اندیشہ تھا۔

آپ نے فرمایا کہ ہندو اس لئے مسلمانوں کو ترک موالات پر اکسارہے ہیں تاکہ مسلمان تمام چیزوں سے محروم ہو جائیں۔ اور ہر حصہ اور محکمہ میں صرف ہندو باقی رہ جائیں۔ ترک موالات میں فاضل بریلوی کی تحریک پر ہندو مسلم اتحاد کے خلاف تقاریر و مضامین کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس ضمن میں سبک پیش پیش مولانا وحی احمد محدث صورتی کے خلف الرشید اور ممتاز عالم دین مولانا عبداللہ پٹیل بھی تھے۔ آپ نے پورے ہندوستان کا دورہ کر کے ترک موالات کی شرعی حیثیت اور اس کے نقصانات سے مسلمانوں کو آگاہ کیا۔ اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اس سلسلے میں قرآنی احکامات کی پابندی کریں۔

(قابلا اعظم کے بہتر سال ۱۵۱)

سلسلہ ”تحریک ترک موالات“ میں پہلا خط جناب مولوی حاکم علی صاحب بی اے پروفیسر سائنس اسلامیہ کالج لاہور کا موصول ہوا القاب و آداب کے بعد لکھتے ہیں۔

پشت ہذا پر فتویٰ مطالعہ گرامی کیلئے ارسال کر کے التجا کرتا ہوں کہ دوسری نقل کی پشت پر اسکی تصحیح فرما کر احقر نیازمند کے نام بوالسبی ڈاک اگر ممکن ہو سکے تاکہ از کم دوسرے روز بھیج دیوں انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس بروز اتوار بتاریخ ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۰ء منعقد ہونا ہے اس میں یہ پیش کرنا ہے کہ دیوبندیوں اور نچریوں نے مسلمانوں کو تباہ کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا ہے۔

ہندوؤں اور گاندھی کیساتھ موالات قائم کر لی ہے اور مسلمانوں کے کاموں میں روڑھا اٹکانے کی ٹھان لی ہے لہذا عالم حنفیہ کو ان کے ہاتھوں سے بچائیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

نیازمند دعا گو حاکم علی بی اے موتی بازار لاہور

(۲۵ اکتوبر ۱۹۲۰ء)

اور اب وہ فتویٰ بھی ملاحظہ فرمائیں جو مولوی حاکم علی بی اے حنفی، نقشبندی، مجددی پروفیسر سائنس اسلامیہ کالج لاہور نے تحریر فرمایا تھا۔ لکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں کافروں اور یہود و نصاریٰ کیساتھ تولی سے منع فرمایا ہے مگر ابوالکلام زبردستی تولی کے معنی معاملات اور ترک موالات کو ترک معاملات (نان کو اپریشن) قرار دیتے ہیں اور پھر بہ صریح زبردستی ہے جو اللہ کے کلام پاک کیساتھ کجا رہی ہے مذکور نے ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء کی جنرل کونسل میں تشریف لاکر اطلاق یہ کر دیا جب تک اسلامیہ کالج لاہور کی سرکاری امداد بند نہ کیا جائے اور لیونروٹی سے اس کا قطع الحاق نہ کیا جائے تب تک انگریزوں سے ترک موالات نہیں ہو سکتی۔

اور اسلامیہ کالج کے بڑوں کو فتویٰ دیدیا کہ اگر ایسا نہ ہو تو کالج چھوڑ دو۔ لہذا اس طرح سے کالج میں سچنبی پھیلا دی کہ پھر بڑھائی کا سخت نقصان شروع

ہو گیا۔ علامہ مذکور کا یہ فتویٰ غلط ہے یونیورسٹی کیساتھ الحاق قائم ہے سے اور امداد لینے سے معاملت قائم رہتی ہے۔ نہ کہ موالات جس کے معنی محبت کے ہیں نہ کہ کام کے جو کہ معاملت کے معنی ہیں۔

مذکور کی اس زیر دستی سے اسلامیہ کالج تباہ ہو رہے ہیں مولوی محمود الحسن صاحب مولوی عبدالحی صاحب تو دیوبندی خیالات کے ہیں۔ ذریعہ دستی فتویٰ اپنے مدعا کے مطابق دیتے ہیں لہذا میں یہ فتویٰ دیتا ہوں کہ یونیورسٹی کیساتھ الحاق اور امداد لینا جائز ہے۔ میرے فتویٰ کی تصحیح اُن اصحاب سے جو دیوبندی نہیں مثلاً مولانا ممدت طاہرہ حضرت مولانا مولوی شاہ احمد رضا خاں قادری صاحب بریلوی علاقہ روہیلکھنڈ اور مولوی اشرف علی صاحب بھانوی

(وسائل رضویہ ص ۸۱)

یہاں یہ عرض کر دوں کہ مولوی حاکم علی کو یہ علم نہیں تھا کہ مولانا اشرف صاحب بھی دیوبندی مسلک سے متعلق ہیں اور علم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں نہایت دل آزا خیالات کا اظہار فرما چکے ہیں۔ جب انھیں اس کا علم ہوا تو بہت پچھتائے۔

بہر صورت امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے قرآن و سنت اور فقہائے امت کے ارشادات کی روشنی میں مفصل جواب مرحمت فرمایا جو مولانا حاکم علی کو وقت سے پہلے مل گیا۔ یہی وجہ تھی کہ علامہ اقبال اور انجمن حمایت اسلام کے اراکین نے خود ساختہ ترک موالات کی تائید نہیں فرمائی۔

امام احمد رضا علیہ الرحمہ فرماتے ہیں

وہ الحاق واخذ و امداد اگر نہ کسی امر خلاف اسلام و مخالفت شریعت سے مشروط، نہ اس کی طرف منجر تو اس کے جواز میں کلام نہیں۔ ورنہ ضرور ناجائز و حرام ہوگا مگر یہ عدم جواز اس شرط یا لازم سبب سے ہوگا نہ بر بنائے تحریم مطلق معاملت جس کے لئے شرع میں اصلاً اصل نہیں اور خود ان مالفین کے طرز عمل اُنکے کذب دعویٰ پر شاہد۔ ریل تار، ڈاک سے کیا معاملت نہیں!

فرق یہ ہے کہ اخذ امداد میں مال لینا ہے اور ان کے استعمال میں دینا۔ عجیب کہ مقاطعت میں مال دنیا حلال ہو۔ اور لینا حرام۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے ریل تار، ڈاک ہمارے ہی ملک میں ہمارے ہی روپے سے بنے ہیں بھائی امداد تعلیم کا روپیہ کیا انگلستان سے آتا ہے؟ وہ بھی یہیں کا ہے تو حلال یہ بھائی کہ مقاطعت میں اپنے مال سے نفع پہنچانا شروع اور خود نفع لینا ممنوع اس الٹی عقل کا کیا علاج!

مگر اس قوم سے کیا شکایت! جس نے نہ صرف شریعت بلکہ نفس اسلام کو پلٹ دیا۔ مشرکین سے ودار بلکہ اتحاد بلکہ غلامی اور انقیاد فرض کیا۔ خوشنودی یہود کیلئے اشعار اسلام بند۔ اور شعار کفر کا ماعتول پر علم بند۔ مشرکین کی جے بیکارنا۔ ان کی حمد کے نعرہ مارنا۔ انھیں اپنی اس حاجت دینی میں جسے نہ صرف فرض بلکہ امداد ایمان بھڑاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس میں شریک نہ ہوں یوں لوں پر حکم کفر لگاتے ہیں اپنا امام و ہادی بنانا۔ مساجد میں مشرک کو لیجا کر مسلمانوں سے اونچا کر کے واعظ مسلمان بھڑانا۔ مشرکین کی کٹھنی کندھوں پر اٹھا کر گھٹ پر لیا جاتا۔ مساجد کو اس کا نام گاہ بنانا۔ اسکے لئے دعائے مغفرت اور جنازہ کے اشتہار لگانا وغیرہ وغیرہ ناگفتہ بہ افعال موجب کفر و مرتد حلال۔

یہاں تک کہ صاف لکھ دیا کہ ”اگر اپنے بندو بھائیوں کو راضی کر لو تو اپنے خدا کو راضی کر لو گے“ صاف لکھ دیا کہ ہم ایسا مذہب بنانے کی فکر میں ہیں جو ہندو مسلم کا امتیاز اٹھا دیگا اور سنگم و پریاگ کو مقدس علامت بھڑائے گا الخ

(وسائل رضویہ ص ۸۶)

کیا متحدہ قومیت اور برادران وطن کا یہ وہی نظریہ نہیں جسے شاہنشاہ اکبر راج کرنا چاہتا تھا وہ بھی ایک نئے دین کا موجد بن رہا تھا۔ اس نے بھی ہندو و نہ رسم و رواج کو فروغ دیا تھا وہ بھی شعائر اسلام کو مٹا دینا چاہتا تھا اس نے بھی ہندو کی محبت میں گدا کشی کو ممنوع قرار دیا تھا۔ مگر اسی کے پوتے عالمگیر اور ننگ زیب نے ان تمام باطل نظریات کی دھجیاں بکھیر دیں۔

بہر صورت وقت کا قلم حق و صداقت اور دین و ملت سے عشق و محبت کو اپنے جلو میں لئے آگے بڑھتا ہے۔ جسکی بے پناہ روان کے سامنے مخرجین قرآن و سنت بے بس ہیں دلائل و براہین حقائق و شواہد کا انڈنا ہوا سیلاب ہر شخص و خاشاک کو بہائے لئے جارہا ہے اس کی چمک دمک اس کی کردک گرج سے اعدائے اسلام بھر پئے ہیں اس کی بے پناہ منو فشانیاں تاریکیوں کا سینہ چھینی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں اس کے ایک ایک حرف ایک ایک لفظ کی حرارت ٹھٹھری ہوئی انسانیت کیلئے، قومی و ملی تشخص کیلئے، مذہب و ملت کیلئے سوچ کی جاں نواز کرنوں کی طرح حیات آفریں ہے۔

ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ اس میں قطعاً کوئی شبہ نہیں کہ امام احمدیہ اس پر آشوب دور میں وہ واحد

شخصیت جس نے باطل کے ہر یلغار کا دندان شکن جواب دیا بالآخر انھیں تسلیم کرنا پڑا کہ

مولوی احمد رضا خاں صاحب اپنے اس فن کے کامل استاد اور بڑے ماہر تھے ندوہ والوں کے پاس اگرچہ اصحاب علم و قلم کی فوج کی فوج تھی اس بریلوی خاں صاحب کے یکفیری اشتہاروں اور رسالوں کی نہ تھمنے والی بارش کو دیکھ کر انھیں بالآخر یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ غیریت اسی میں ہے کہ ان باتوں کا کوئی ٹولس نہ ہو۔ (بریلوی فتنہ کا نیاروپ مٹا)

مولوی محمد عارف سنبھلی کو یہ کون بتائے کہ ان کی مذکورہ عبارت سے کتنی بے بسی ٹپک رہی ہے اسے دوسرے لفظوں میں شکست خوردہ ذہنت کا نیاروپ کہا جاسکتا ہے انکی فوج کی فوج بھی ایک سپاہی کے سامنے بے بس نظر آتی ہے۔ امام احمد رضا علیہ الرحمہ کی گرفت شرعی اصول پر مبنی تھی جسے ان علمائے کرام کا پورا لشکر بھی نہیں توڑ سکتا تھا۔ ترک موالات کے بابے میں امام احمد رضا فرماتے ہیں۔

کہ لیڈر امداد چھڑتے ہیں (اور خود) مخرّب دین تعلیموں پر قائم ہیں انگریزوں کی تعزید اور فیشن وغیرہ سے آزادی اور دہریت و بے دینی سے نجات بہت دل خوش کن الفاظ ہیں۔ خدا ایسا ہی کرے

مگر یہ صرف ترک امداد اور الحاق (وغیرہ) سے حاصل نہیں ہو سکتے اس آگ کو بجھانے سے میننگے۔ جو سید احمد خاں نے لگائی ہے جسکی پٹیں لیڈروں میں اب تک موجود ہیں..... جب تک فرنگی نظام تعلیم کو بدل کر مذہب آشنا نہ کیا جائے دہریت و بخیریت کی بیخ کی نامکن ہے۔ کیا لیڈر اس بات کی کوشش کر رہے ہیں؟ ہرگز نہیں! صوف امداد و الحاق ترک کر لیتے ہیں۔ جو ظاہری تعلق ہیں۔ اور تعلیمات کے گہرے تعلقات نہ چھڑاتے ہیں نہ چھوڑینگے۔ (مختصر رسائل رضویہ ص ۹۲)

آپ بھی غور فرمائیں کہ لوگ آج نظام تعلیم کی تبدیلی کے متعلق بڑے گھمبیر انداز میں سوچ رہے ہیں اور ماضی کے نظام تعلیم کو غلط، بیکار اور عبث قرار دے رہے ہیں۔ دین و مذہب۔ اخلاق و دھروت سے دوری کے اسباب میں نظام تعلیم ہی کو ذیل فرمایا جا رہا ہے۔ اسکے لئے باقاعدہ۔ مذاکرات ہوتے ہیں۔ سیمینار قائم کئے جاتے ہیں اور طلباء کی یونینیں مطالبہ کرتی ہیں کہ موجودہ نظام تعلیم ملک و ملت کیلئے ناسور ہے اسرطان ہے مگر امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے ۱۹۲۰ء میں اس ضرورت کو محسوس فرمایا تھا۔ اور بلا خوف تردید اس کا اعلان بھی فرما دیا تھا۔

آپ سچ گم ہر طرف دھواں ہی دھواں

وائے برسی سید احمد خاں (جوش)

امام احمد رضا فرماتے ہیں کہ لیڈر نصاریٰ کی ادھوری غلامی چھوڑتے اور سرکین کی پوری غلامی مناتے ہیں، کیا یہ وہی لوگ نہیں جنھوں نے ماضی میں قولاً اور عملاً انگریزوں کی حمایت کی تھی مگر اب شاکس ہیں! اور اب چھوڑنا چاہتے ہیں مبارک ہو اور خدا سچ کرے اور راست لائے مگر انصاف کیجئے۔

وہ غلامی جو سرسید نے اختیار کی ادھوری تھی (اس لئے کہ) سید احمد خاں نے کسی پادری یا نصرانی کو امر دین میں صراحتہ اپنا امام و پیشوا نہ لکھا تھا

آیات و احادیث کی تمام عمر کو پرچ یا صلیب پر نشان کرنا نہ کہا تھا۔ کسی پادری کو مساجد میں مسلمانوں کا داعظ و مادی نہ بنایا تھا۔

نصرانیت کی رضا کو خدا کی رضا یا کسی پادری کو نبی بالقہ نہ بنایا تھا۔ اور اب مشرکین کی پوری غلامی ہو رہی ہے۔ اُن کے ساتھ یہ سب کچھ اور اُن سے بہت زیادہ کیا جا رہا ہے یہ کو نسا دین ہے (کہ) نصاریٰ کی ادھوری (امداد) سے اجتناب اور مشرکین کی پوری میں غرقاب (مخلصاً)۔
(رسائل رضویہ ص ۹۴)

دید و شنید ظاہر ہے کہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے دلائل کے سامنے عارف سبھلی اور اُن کے اگلے بے بس تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تحریک قیام پاکستان کے دوران یہ اعتراف کیا جاتا تھا کہ محمد علی جناح کوٹ پتلون پہنتے ہیں، انگریزی بوتے لیتے ہیں انگریزوں کیساتھ اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ لہذا ان کا ساتھ نہیں دینا چاہئے۔

جمعہ کا دن تھا اور حضرت مولانا غلام یزدانی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جو حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کے شاگرد تھے تقریر فرما رہے تھے اور اُن کا بیان یہ تھا کہ ہمیں بہر صورت قیام پاکستان کی حمایت کرنی چاہئے۔ لوگ محمد علی جناح پر اعتراضات کرتے ہیں۔ اگر وہ صحیح بھی ہوں تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ محمد علی جناح مسلمانان ہند کے وکیل ہیں دامیر المؤمنین) نہیں ہیں۔ انہوں نے ایک اچھے کام کا اقدام کیا ہے۔ دنیا میں ایک اسلامی سلطنت کے قیام کی جدوجہد کر رہے ہیں لا الہ الا وہ کا پیغام گوئیے گا۔

کسی نے دوران تقریر ہی میں پوچھ لیا کہ حضرت ہمیں اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ آپ نے برجستہ فرمایا کہ اسلام کا فائدہ ہمارا فائدہ ہے۔ چاہے وہ کہیں بھی کسی خطہ میں کیوں نہ ہو۔

کیا یہ کم فائدہ ہے کہ ہمارے کئی کروڑ مسلمان بھائی آزاد حکومت میں اسلام کے پرچم کے نیچے امن و سکون کا سانس لے سکیں گے۔ اگر ہماری قربانیوں سے ہمارے مسلمان بھائیوں کو فائدہ پہنچے تو اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ ہمیں بہر صورت ہر قسم کی قسربانی کیلئے تیار رہنا چاہئے۔

پھر آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ محمد علی جناح کا ساتھ دینے پر اس لئے معترض ہیں کہ محمد علی جناح سچے پکے باشرع مسلمان نہیں۔ میں کہتا ہوں پھر گاندھی، نہرو، دیبھ بھائی پٹیل کا ساتھ کیوں دیا جا رہا ہے کیا یہ سچے پکے خدا پرست مسلمان ہیں۔ کیا انہوں نے بت پرستی سے توبہ کر لی ہے کیا انہوں نے دھوٹی، چوٹی کو خیر باد کہہ دیا ہے کیا انہوں نے دید، گیتا کو چھوڑ کر قرآن خوانی شروع کر دی ہے اور کسی شیخ الہند اور شیخ الحدیث کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے ہیں۔ قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق مشرک بت پرست بہر صورت مسلمانوں کے دشمن ہیں اور عیسائی مسلمانوں کے قریب ہیں۔

انہیں دنوں ایک واقعہ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ مولانا مدنی تقریر فرمانے آئے۔ دوران تقریر محمد علی جناح کی سخت توہین کی اور تقریباً وہی اعتراضات کئے کہ محمد علی جناح پکے مسلمان نہیں۔ انہیں کلمہ تک نہیں آتا۔ تو کسی نے پوچھ لیا حضور کیا نہرو اور گاندھی جی پکے مسلمان ہیں اور انہیں کلمہ آتا ہے۔ اور ابھی مولانا جواب ہی سوچ رہے تھے کہ سنگ بانی شروع ہو گئی اور پورے جلسہ درہم برہم ہو گیا۔ اور وہ براہِ دران وطن (منہود) جو اس جلسہ کے انتظام میں بڑے پرجوش اور پیش پیش تھے مولانا مدنی کی بغیر خبر لئے فراموش ہو گئے۔

موالات ہر کافر سے حرام ہے امام احمد رضا علیہ الرحمہ فرماتے ہیں موالات ہر کافر و مشرک سے حرام ہے اگرچہ ذی مطیع اسلام ہو۔ اگرچہ اپنا باپ، یا بیٹا، یا بھائی یا قریب ہو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

تو نہ پائے گا اُن لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں اللہ اور قیامت پر کہ دوستی کریں اللہ و رسول کے مخالفوں سے اگرچہ اُنکے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کہنے والے ہوں (قرآن کریم)

سورہ آیت نمبر

حالانکہ یہ موالات حقیقیہ نہیں تھی اسکے باوجود مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی گئی جیسا کہ بخاری و مسلم میں اس آیت کریمہ کے بارے میں مذکور ہے کہ
”اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو سخت جھڑکی ہے اس بات پر کہ کافروں سے وہ بات

کریں جو بظاہر محبت ہو اگرچہ حقیقت میں دوستی نہ ہو، (بخاری و مسلم)

معاملت کا جواز امام احمد رضا علیہ الرحمہ فرماتے ہیں، "معاملت مجرہ سولے مرتدین کے ہر کافر سے جائز ہے؟ جب کہ اس میں نہ کوئی اعانت کفر یا معصیت ہو۔ نہ اضرار اسلام و شریعت کا نقصان ہو (ورنہ ایسی معاملت جس میں اعانت کفر و معصیت اور اسلام و شریعت کا نقصان ہو) مسلم سے بھی حرام ہے چہ جائیکہ کافر۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔

نہ آغاز بہتر نہ انجام اچھا امام احمد رضا علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

اور تعلیم کیلئے گورنمنٹ سے امداد قبول کرنا جو نہ مخالفت شرع سے مشروط نہ اس کی طرف منجر ہو یہ تو نفع بے غائلہ ہے۔ جس کی تحریم پر شرع مطہر سے اصلاً کوئی دلیل نہیں۔ دین پر قائم رہو زیادت نہ کرو۔ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے سلاطین کفار کے ہدایا قبول نہ فرمائے (میں اُن اسلامیہ اسکولوں اور کالجوں کی بات کر رہا ہوں جن میں کفریات کی تعلیم نہیں ہوتی)۔ بے دہ اسکول اور کالج جن میں خلاف شرع تعلیم دی جاتی ہے تو ان میں ویسے بھی تعلیم و تعلم حرام ہے۔ اور یہ حضرات جو آج تحریک ترک موالات میں پُرجوش نظر آتے ہیں (انھیں بڑی بڑی ڈگریاں کہاں سے حاصل ہوئی ہیں۔ کیا اس وقت جہانتیں نہیں تھیں۔ اب ہوئی ہیں؟

اور جب آنکھ کھلی تو صرف ایک گوشہ انگریزوں کی طرف۔ اور وہ بھی شریعت پر زیادت کیساتھ کہ اُن سے مجرہ معاملت بھی حرام قطعی بلکہ کفر اور شرکوں کی طرف کی پہلے سے بھی زیادہ پٹ ہو گئی کہ اُن سے ودا و اتحاد واجب بلکہ انجی غلامی اور انقیاد فرض۔ انھیں راضی کر لیا تو خدا کو راضی کر لیا تو نایت مولا کہ اسلام ان حضرات کو نہ جب مد نظر تھا۔ نہ اب مد نظر ہے۔ ورنہ مشرکوں کے اتحاد و انقیاد کے فتنے نہ جا گتے۔ چہ نہ آغاز بہتر نہ انجام بہتر۔ ملخصاً

(رسائل رضویہ ص ۹۷)

موالات و معاملات اس باب میں گفتگو کرتے ہوئے مجھے بار بار جناب علامہ عثمانی کا وہ تجزیہ یاد آتا ہے جو انہوں نے اپنے اساتذہ کرام (

علمائے دیوبند) کے عادات و اطوار اور انکی ہٹ دھرمی و ضد کے بارے میں کہا تھا کہ "اپنی کسی غلطی کو تسلیم کرنا تو ہمارے آج کے بزرگان دیوبند نے سیکھا ہی نہیں! انہوں نے صرف یہ سیکھا ہے کہ اپنی کہے جاؤ اور کسی کی مت سنو۔۔۔ ماہنامہ تجلی ص ۱۹۷

حق یہ ہے کہ دوسرے مسائل کی طرح اس باب میں بھی یہ علمائے کرام۔ بشمول ابوالکلام۔ صراط مستقیم سے ہٹ کر اور انتباہ کے باوجود اب تک ہٹ دھرمی قائم ہے۔ اس باب امام احمد رضا فرماتے ہیں۔

ترک معاملات کو ترک موالات بنا کر قرآن عظیم کی آیتیں کہ ترک موالات میں ہیں سوچیں مگر تو نے مسٹر گاندھی سے ان سب میں استثنائے شرکین کی پھر لگائی۔ کہ آیتیں اگرچہ عام ہیں مگر ہندوؤں کے بارے میں نہیں۔

ہندو تو ہادیان اسلام ہیں۔ آیتیں صرف نصاریٰ کے بارے میں ہیں اور نہ کل نصاریٰ فقط انگریز۔ اور انگریز بھی کل تک اس کے مورد نہ تھے حالات حاضرہ سے ہوئے ایسی ترمیم شریعت، و تغیر احکام، و تبدیل اسلام کا نام خیر خواہی اسلام رکھا ہے ترک موالات کفار میں قرآن عظیم نے ایک دوسرے بیس جگہ تاکید شدید پر اکتفا نہ فرمائی بلکہ بکثرت جا بجا کان کھول کھول کر تعلیم حق سنائی اور اس پر تبنیہ فرمادی کہ

فَدَا بَيِّنَاتٍ لَّكُمُ الْآيَاتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ۔ "ہم نے تمہارے واسطے آیتیں صاف کھول دی ہیں اگر تم عاقل ہو" مگر توبہ کہاں عقل۔ کہاں کان، یہ سب تو ودا و ہندو پر قربان لاجرم ان سب سے ہندوؤں کا استثناء کرنے کیلئے بیڑے بڑے آنا دیڈروں نے قرآن عظیم میں تحریر نہیں کیں۔

(رسائل رضویہ ص ۹۷)

اس کے ساتھ ہی امام احمد رضا علیہ الرحمہ اس باب میں ایک طویل بحث فرماتے ہیں

اور ہندوؤں کے اُن بے پناہ مظالم کا ذکر کرتے ہیں۔ انہوں نے گٹار پور، آره وغیرہ میں کئے گئے تشدد کا ذکر فرمایا۔ قرآن عظیم کو برسرِ عالم بھاڑے جانے اور جلائے جانے کے واقعات بیان فرمائے مسیحیوں کو منہدم و مسمار کیا گیا، مسلمانوں اور اُن کے گھروں کو تیل چھڑک کر کربلا دیا گیا ان حالات کے پیش نظر امام احمد رضا بڑے چبھتے ہوئے انداز میں دیانت فرماتے ہیں۔

اب کوئی دردِ سیدہ مسلمان یہ کہہ سکتا ہے یا نہیں کہ اے اسٹیجوں پر سلمان بنے والو ہمدردی اسلام کا ظاہری تاننا تھنے والو! کچھ جاکانام باقی ہے تو ہندوؤں کی لنگا میں ڈوب مرو اسلام و مسلمین و مساجد و قرآنِ عظیم توڑیو لالے کیا تمہارے بھائی تمہارے چچیتے، تمہارے پیارے تمہارے سردار، تمہارے پیشوا تمہارے مددگار تمہارے غمگسار مشرکین ہند نہیں! جن کے ہاتھ آج تم بکے جاتے ہو۔ جنگی غلامی کے گیت گاتے ہو۔ (رسائل رضویہ ص ۱۳۸)

مولانا ظفر علی برہم ہو گئے
مولانا نے حسبِ عادت گاندھی جی کی سچو لکھ کر ان کی مٹی پلید کر ڈالی۔ مولانا فیض احمد صاحب ”مہرِ مہر“ میں تحریر فرماتے ہیں

اس اختلاف کی ابتدا کراچی میں کانگریس کے سالانہ اجلاس میں ہوئی کہ مولوی ظفر علی خاں جلسہ کی کاروائی نماز کیلئے بند کرنا چاہتے تھے کہ نماز کے بعد پھر شروع کیا جائے۔ گاندھی جی نے اس سے انکار کر دیا۔ جس پر یہ واک آؤٹ کر گئے۔

گیٹ سے نکل پڑے تھے کہ ایک ہندو خاتون رضا کا رتنے آوازہ کسا کہ ”مولانا کیا آپ عرب سے تشریف لائے ہیں۔“

لہذا مولانا ظفر علی خاں نے گاندھی کی شان میں قصیدہ کہہ ڈالا
اے سامری وقت کہ گاندھی ہے تیرا نام - کہتے ہیں نصاریٰ کا تھے بندہ بے دام
ہندو کو مسلمان سے بڑا ہے تیرا کام - ہنکو نظر آتا ہے جو ہوگا تیرا انجام

اے دشمنِ اسلام
تقدیرِ وطن کی اُسی دن سے ہوئی کھوئی - جب شیخ کے ہمد سے ملی تری لنگوئی
اور چادر تہذیبِ عرب ہو گئی چھوٹی - ہم قائلِ الہام ہیں تو مائلِ ادہام
اے دشمنِ اسلام
(مہرِ مہر ص ۲۴۸)

تمام مشرکین ہند محارب بالِ فعل ہیں
اس باب - میں امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے ارشادات سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ اُس دور کی تاریخ اور اُس وقت کے جملہ کوالف پر نظر ہو۔

اس میں قطعاً کوئی شبہ نہیں کہ وہ دور مسلمانانِ برصغیر کیلئے انتہائی نازک دور تھا اسلامی تشخص کی پامالی پر خود علما کا ایک طبقہ کربِ نظر آ رہا تھا یہ لوگ آیاتِ الہی کے بے معنی تاویل اور قرآنِ خدا کی تحریف کے مرتکب ہوئے تھے اور یہ سب ہندوؤں کی ثبوت و چاہت اور اُن سے دراد و اتحاد کی بدولت ہو رہا تھا۔

ان علما اکرام سے جب یہ عرض کیا گیا کہ ہندوستان پر ظلم و ستم ڈھا رہے ہیں۔ مسلمانوں کے نہ صرف گھروں، کھیتوں کو بلکہ انھیں بھی زندہ جلا یا جا رہا ہے۔ قرآنِ کریم اور مساجد کی بخرمتی کی جا رہی ہے، شعائرِ اسلام کی ادائیگی سے روکا جا رہا ہے۔ اور آپ حضرات ان سے وداد و محبت اور یکگانگت کی باتیں کر رہے ہیں۔ حالانکہ مشرکین سے قتال کا حکم آیا ہے خصوصاً جبکہ مشرک خود جارح ہوں۔ تو جواب یہ ملا کہ گاندھی جی تو ایسا نہیں کر رہے ہیں بڑائی کرنے والے ہندوؤں کے چند طبقے ہیں اس لئے آیات کے مصداق سب ہندو نہیں ہو سکتے۔ اور پھر امام وقت کا قلم برہم ہو گیا۔ رہو ا قلم کی تیزی نے دلوں کو موہ لیا۔ فرماتے ہیں۔

کیا زمانہ رسالت جنگی نسبت حکم ہوا ”انھیں (مشرکوں کو) جہاں پاؤ قتل کرو“
اور حکم ہوا سب مشرکوں سے بڑو جیسے وہ تم سب سے بڑے ہیں۔“
کیا ان کا ہر ہر فرد میلانِ جنگ میں آیا تھا دراصل بڑائی کے اسباب کو مدنظر رکھا جائیگا۔ اگر جو بڑے اس کی خاص کوئی ذاتی غرض ہے جس میں ساری قوم

(کسی طرح سے) شریک نہیں تو وہ لڑائی خاص انھیں لڑنیوالوں کی طرف منسوب ہوگی جو اس کے متکلب ہوئے۔۔۔۔ نہ تمام قوم کی اور اگر لڑائی مذہبی ہے تو ان سب اہل مذہب کی ہے کہ باقی دئے درے تلے تدے متعین ہوں گے اور کچھ نہ ہو تو راضی ہوں گے اور اپنے مذہب کی فتح ہو تو خوش ہوں گے۔ اور دوسرے کی ہو تو رنجیدہ ہوں گے (جیسا کہ) اِنْ تَسْتَكْبِرُوا فَسَيَكُنْ غِيَاظُنَا وَمِنْ أَجْلِ عَصَاكَ تُصَبِّحُ بِسَيْفَةٍ يُفَرِّقُونَ بھلا (اگر تمیں بھلائی پہنچے تو انھیں بری لگے اور اگر تمیں برائی پہنچے تو اس پر شادال ہوں) (لہذا) سب محاربین بالفعل میں خواہ ہاتھ سے زبان سے، یا دل سے

اور یہ قربانی کاؤ کا مسئلہ ایسا ہی ہے۔ کونسا ہندو ہے جسکے دل میں اس کا نام سنا کر آگ نہیں لگتی کونسی ہندو زبان ہے جو کٹور کھٹا کا مالہ نہیں جیتی۔ کونسا شہر ہے جہاں اس کی سیما یا اس کے ارکان۔ یا اس میں چندہ دینے والے نہیں۔ کیا یہ مقدس بے گناہوں کے خون۔ یہ پاک مساجد کی شہادتیں۔ یہ قرآن عظیم کی آیتیں۔ انھیں ناپاک رکھشاؤہ انہیں مجموعی سفاک سبھاؤں کے نتائج نہیں!

نہ سہی! ہاتھ کنکرن کو آری کیا ہے۔ اب جس شہر جس قصبہ جس گاؤں میں چاہو آؤ مادیکھو اپنی مذہبی قربانی کیلئے گائے بچھاؤ۔ اس وقت یہی تمہاری بائیں پسلی کے نکلے۔ یہی تمہارے سگے بھائی، یہی تمہارے منہ بولے بزدل یہی تمہارے آقا۔ یہی تمہارے پیشوا تمہاری ہڈی پسلی توڑنے کیلئے تیار ہوتے ہیں یا نہیں؟

وہ جو آج تمام ہندوؤں اور نہ صرف ہندوؤں تم سب ہندو پرستوں کا امام ظاہر اور بادشاہ باطن ہے یعنی گاندھی صاف نہ کہہ چکا کہ مسلمان اگر قربانی نہ چھوڑیں گے تو ہم تلوار کے زور سے چھڑا دیں گے

(رسائل رضویہ ص ۱۱۱)

میں وہ مسکت و مبکت دلائل جن کے جواب سے یہ پورا طبقہ عاجز تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ سیدنا امام احمد رضا علیہ الرحمہ پر انگریز نوازی کا دل آزار بہتان لگایا گیا ورنہ انھیں چاہئے کہ کوئی ایسا دستاویزی ثبوت پیش کریں جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ امام احمد رضا نے انگریزوں کی حمایت کی تھی۔

بریلی میں ابوالکلام آزاد کا کھلا اجلاس و صدر الشریعہ کا تمام حجت نامہ اس کے واقعات

و کوائف کو جناب مفتی برہان الحق صاحب نے «اکرام امام احمد رضا» میں اور پروفیسر محمد محمود احمد صاحب نے «تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم» میں بڑی تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔

واقعہ یوں ہوا کہ غالباً ماچ ۱۹۲۱ء میں جمعیت علماء ہند کے زیر انتظام بریلی شریف میں ابوالکلام آزاد کا ایک کھلا اجلاس رکھا گیا تھا اور جھونک میں یہ اشتہار بھی شائع کر دیا گیا تھا کہ «مولانا آزاد اس اجلاس میں مخالفین پر تمام حجت بھی کرینگے»

حالانکہ اس سے پہلے بریلی ہی میں جمعیت علماء ہند کا ایک اجلاس ہوا تھا اس موقع پر مولانا آزاد اور حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ (خلیفہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ مصنف بہار شریعت اور حضرت علامہ شیخ الحدیث عبدالمصطفیٰ الازہری مظلہ العالی کے والد ماجد) کے درمیان سیاسی امور پر گفتگو کرنے اور اختلافات کو ختم کرنے کیلئے مراسلت ہوئی تھی جو بے نتیجہ رہی تھی اب جو جلسہ کا اعلان ہوا اور گفتگو کی دعوت دی گئی تو پھر علمائے کرام کا ایک وفد مرتب کیا گیا۔ اور حضرت صدر الشریعہ نے نشر سوالات مرتب کئے جسے «تمام حجت نامہ» کے نام سے شائع کیا گیا اور نہ صرف منتظین جلسہ بلکہ آزاد صاحب کے پاس بھی بھیج دیا گیا کہ انکے جوابات تیار رکھیں۔

اور پھر علمائے کرام کا یہ وفد (جن کا ہر فرد علم و فضل کا ہلال تھا) رات کو ۹ بجے درود سلام کا ورد کرتا ہوا جلسہ گاہ میں پہنچ گیا۔ رضا کاروں نے انھیں اسٹیج پر پہنچا دیا۔

آزاد صاحب نے پوچھا کہ آپ لوگوں کا صدر کون ہے۔ جواب میں جناب سید سلیمان اشرف صاحب پروفیسر علی گڑھ یونیورسٹی (جو امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے خلیفہ تھے) نے فرمایا کہ میں ہوں

اور انھیں ازراہ نوازش چند منٹ خطاب کی اجازت دی گئی۔ مگر اسی چند منٹ نے سماں بدل دیا۔ اس کے فوراً بعد ہی فاضل بریلوی علیہ الرحمہ کے صاحبزادے حامد رضا خاں علیہ الرحمہ نے خطاب فرمایا اور تفصیل سے گفتگو فرمائی۔

اور مولانا آزاد کو یہ بات کہنی پڑی کہ "موالات جیسی نصاریٰ کیساتھ حرام ہے ہندو کیساتھ بھی حرام ہے" اس کے بعد مفتی برہان الحق صاحب جلیپوری کے اعتراضات نے مولانا آزاد کو فک کر دیا۔ اور یہ وفد آگیا پھر کیا ہوا؟ کیا مولانا آزاد اور ان کے متبعین نے ہندوؤں کی تقلید سے توبہ کر لی؟ ہرگز نہیں میں کہتا ہوں یہ علمائے کرام جنھیں انکی اولاد، علمائے دینی اور علمائے حق کہتے ہوئے نہیں ٹھکتی، "کتمان حق" کے مرتکب ہوئے ہیں اور خدا سے جبار و قہار کے حضور بہر صورت انھیں جوابدہی کرنی پڑے گی۔

مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں

"یہ کیا بات کہ ان چیزوں سے ڈرتے نہیں حق کا اظہار کرتے ہوئے ڈرتے ہو چنانچہ ان تحریکات میں دیکھ لو کہ ہندوؤں کی وجہ سے کسی قدر کتمان حق کیا گیا دین کو اور مسائل کو صاف بیان نہ کر سکے (افاضات الیومیہ حصہ ششم ص ۲۵۸) یہاں یہی کہا جاسکتا ہے کہ۔۔۔ یہ نشہ وہ نہیں جسے تشریٰ اُتار دے

موالات کی تقسیم اور اس کے احکام امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے "موالات" کے جملہ اقسام پر سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔ چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں۔

موالات کی دو قسم ہے اول حقیقیہ جسکا ادنیٰ رکون یعنی میلان قلب ہے پھر وداد پھر اتحاد۔ پھر اپنی خواہش سے بے خوف و طمع انقیاد پھر تبتل یہ جمیع وجوہ ہر کافر سے مطلقاً ہر حال میں حرام ہے (الحجۃ المومنۃ رسائل رضویہ ص ۱۲۹)

اس کے ساتھ ہی آپ میل طبعی کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں وَلَا تَرْکَبُوا إِلَى الدِّینِ ظُلُمًا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ۔ (ظلموں کی طرف میل نہ کرو کہ تمہیں آگ چھوئے)

اور پھر ارشاد ہوتا ہے۔

مگر میل طبعی جیسے ماں باپ اولاد... کی طرف کہ جس طرح بے اختیار موزیر حکم نہیں پھر بھی اس تصور سے کہ یہ اللہ و رسول کے دشمن ہیں ان سے دوستی حرام ہے بقدر قدرت اس کا دیا ناپاں تک کہ بن پڑے تو فکا کر دینا لازم ہے قَالَ تَعَالَى يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنَّ السُّؤْبَةَ لِلْكَفَرِ عَلَى الْإِيمَانِ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَاذْلِكُمْ هُمْ الظَّالِمُونَ۔ (اے ایمان والو! اپنے باپ، بھائیوں کو دوست نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر پند کریں اور تم میں جو ان سے دوستی رکھیں گے وہی پکا ظالم ہوگا۔ الحجۃ المومنۃ رسائل رضویہ ص ۱۲۹)

اس کے بعد موالات صورتیہ کے احکام صادر فرماتے ہیں، مدارات کا بیان ہوتا ہے۔ حربی غیر معاہدہ سے موالات کی حالی صورت کے متعلق تفصیل بیان فرماتے ہیں آیات مُتَّخِذَہ میں بڑے معاملات کی مراد کا ذکر ہوتا ہے۔ معنی انقطاع کی تحقیق و توضیح فرماتے ہیں۔ پھر اس الزام کی تردید فرماتے ہیں کہ "مولانا احمد رضا انگریزوں کے خوش کرنے کیلئے مسلمانوں کا تباہ کرنا لامسئلہ نکالا ہے"۔ آپ فرماتے ہیں۔

مسائل سے غامدان شرع کا مقصد کسی مخلوق کی خوشی نہیں ہوتا صرف اللہ عزوجل بندوں کو اُس کے احکام پہنچانا وَلِلّٰهِ الْحُكْمُ سنئے! ہم کہیں واحد قہار اور اس کے رسولوں اور آدمیوں سب کی ہزار ہزار لعنتیں جس نے انگریزوں کو خوش کر نیکو تباہی مسلمان کا مسئلہ نکالا ہو۔ نہیں نہیں بلکہ اُس پر بھی جس نے حق مسئلہ نہ رضاؑ خدا و رسول نہ تبنیہ و اکاہی مسلمان کیلئے بتایا ہو۔ بلکہ اس سے خوشنودی نصاریٰ اس کا مقصد و مدعا ہو۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ لیجئے کہ اللہ واحد قہار اور اس کے رسولوں اور ملائکہ اور آدمیوں کی ہزار در ہزار لعنتیں ان پر جنھوں نے خوشنودی نہ کہین کے لئے تباہی اسلام کے مسائل دل سے نکالے اللہ عزوجل کے کلام و احکام تحریف و تفسیر

سے کا پاپٹ کر ڈالے۔ شعائر اسلام بند کئے، شعائر کفر پسند کئے، بشر کو
کو امام دہادی بنایا اُن سے وداد و اتحاد منایا۔

(رسائل رضویہ ص ۱۴۵)

اس مقام پر اگر سوچ میں ایک ہیجانی برپا ہو جاتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ مجدد وقت
امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے اخلاص عمل کو نہراہوں نہراہ اسلام کرے جس نے جو کچھ کیا اللہ و رسول
کیلئے کیا اہل ایمان کی فلاح و اصلاح کیلئے کیا جس کے عمل میں نصائیت کو قطعاً کوئی دخل
نہیں تھا۔

کیا کوئی امام الہند، کوئی شیخ الہند، کوئی شیخ العرب والعجم اس نوعیت سے گفتگو کر سکتا ہے
؟ ہرگز نہیں۔ قدم قدم بے تماشا دولت سمیٹنے والے للہیت کے اس باندی تک نہیں پہنچ سکتے۔
آج تک تاریخ امام احمد رضا علیہ الرحمہ پر یہ دھبہ لگانے سے قاصر ہے۔ تمام مترجمین و محالفت
کے باوجود کوئی مورخ امام احمد رضا کے دامن کو حرص و آرزو جیسی لعنت سے آلودہ نہ کر سکا
الحمد للہ علی منہ وکرمہ۔

امام احمد رضا علیہ الرحمہ پر زبردست الزام یہ ہے کہ وہ لوگوں کو کافر کہا کرتے تھے اور یہ
بھی سراسر بہتان ہے امام احمد رضا نے آج تک کسی مسلمان کو کافر نہیں کہا۔ کافر صرف انھیں
کہا گیا جو کفر کے مرتکب ہوئے۔ امام احمد رضا علیہ الرحمہ پر طنز کرنا لے یہ کیوں نہیں سوچتے
کہ بالآخر انھیں کافر کس بنیاد پر کہا گیا ہے۔

کافروں، مشرکوں، منافقوں سے بھائی چارہ

ہے کہ مسلمان اور مشرک میں بنیادی نظریات کا اختلاف ہے اور یہ آپس میں کبھی بھی درست
نہیں بن سکتے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب بھی اور جہاں بھی اس کا تجربہ کیا گیا
مسلمان اپنی تمام تر توت و جبروت کے باوجود یا مال ہو گئے یہی وجہ ہے کہ قائد اعظم محمد علی
جناب، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی جیسے لوگ جنکی بے پناہ کوششوں کی وجہ سے کانگریس
کانگریس نبی تھی اُس سے الگ ہو گئے کہ ہندوؤں کیساتھ ایک باضمیر و باعزت مسلمان کا

گزارہ نامکن تھا۔ مگر اُن علمائے کرام کو کیا کہا جائے جو شیخ القرآن اور شیخ الحدیث ہونے سے
باوجود اپنے ایمان و ضمیر کا سودا کر بیٹھے تھے کتنی عجیب بات ہے کہ اہل علم حضرات اجتماع
ضدین کیلئے کوشاں تھے۔

امام احمد رضا علیہ الرحمہ فرماتے ہیں

قرآن عظیم کے صفحات مشرکین سے اتحاد و وداد حرام کرنے سے گورج ہے ہیں۔
لَیْسَ بِاَنَّکُمْ اَعْلَمُ اَمَّا اللّٰهُ (مصلحت شرعی تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ) جو
فرماتا ہے لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِنْ دُونِکُمْ لَا یَاْلُوْنِکُمْ خَبَآلًا
وَدَّعَا مَا عِنْتُمْ (کسی غیر مسلم کو اپنا لازد امت بناؤ وہ تمہاری بدخواہی میں گی
(درگذر) نہ کر نیلے انکی دلی تمنا ہے تمہارا مشقت میں پڑنا)
(رسائل رضویہ ص ۱۴۵)

مشرکوں سے عقد موافقات، بھائی چارہ۔ کہ برادران وطن ہندو بھائی اللہ عزوجل
فرماتے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ اِخْوَةٌ (مسلمان آپس میں بھائی ہیں) تم کہو تَحَنُّ وَا
الْمُسْرُکُوْنَ اِخْوَةٌ (ہم اور مشرکین آپس میں بھائی ہیں) (یعنی قرآن عظیم کے ارشاد کے مطابق)
اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَتُوبُ اِلَیْکَ اِنِّیْ نَاقِصُوْا یَقُوْلُوْنَ وَاِلَیْکَ اِنِّیْ اَتُوبُ اِلَیْکَ اِنِّیْ نَاقِصُوْا
دیکھا منافقوں کو کہ اپنے بھائی کافروں سے کہتے ہیں
(رسائل رضویہ ص ۱۴۵)

کافروں سے اتحاد کا حکم اور مولانا اشرف علی تھانوی کا اقرار

شکل ہے کہ اک بنو حق بین حق اندیش خاشاک کے توفے کو کہے کوہ دماوند

شیخ یہ ہے کہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ بقول علامہ اقبال ع نوار تبلیغ تری زن چوں ذیل نہ کہی
نخ نواں پر مجبور تھے۔ حال یہ تھا کہ کچھ ہم بھی کھسکتے ہیں کچھ تم بھی کھسک آؤ۔ ہندوؤں کا عہد سناؤ
خیر کوئی معنی نہیں رکھتا مگر صدمہ تو یہ تھا کہ مسلمان کھسک رہے تھے اور حد تو یہ ہے کہ شیخ ہندو
کے ماتھے پر قشقہ لگتا تھا اور انھیں احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اور یہ بڑی

ہو سناک بات تھی۔ مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں

تحریک خلافت میں تو بہت ہی زیادہ مسائل میں تحریف کی گئی جس جو مصلحت ہوتی
گی اسی کو مسئلہ بناتے گئے کثرت سے عوام کو بدعتیہ کی ہو گئی کہ کبھی کبھی کچھ ایسوں
نے تو حقیقت کو ہی بدل دینا چاہا تھا مگر اللہ نے حفاظت فرمائی کہ ایک ایسی
جماعت کو متعین فرما دیا کہ وہ اظہار حق کرتی رہی۔

(انکشافات البیوت چہ ششم ۲۷ ص ۳۷)

ان حالات میں ہنگاموں کا نشین تہہ وبالا کرنے کیلئے ضروری تھا کہ مروج تہذیبوں کا عمل
بھی جاری رہے۔ میں بالیقین کہہ سکتا ہوں کہ وہ جماعت جسکی طرف مولانا اشرف علی صاحب تھانوی
نے اشارہ فرمایا ہے وہ اہلسنت و جماعت تھی جو امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے پیرو اور متبع تھے
جہاں نادر و مصلحت اندیشی، تمق و چالپوسی اور جی حضوری کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اظہار
حق کے معاملہ میں انھوں نے کبھی رو رعایت سے کام نہیں لیا۔ کبھی بھی ٹوٹہ لایم کو خاطر میں
نہیں لائے۔ اور نہ ہی یہ لوگ اشاروں اور کنایوں میں گفتگو کرنے کے عادی تھے۔ جو بات
بھی کی گئی صاف کی گئی۔ جو کچھ کہا گیا صاف کہا گیا۔ کیونکہ

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے اگر کانٹے میں ہو توئے حریری

امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ کافروں سے اتحاد کرنا بے حکم قرآن کافر ہیں اور یہ بھی فرمایا
کہ کافروں کا حلیف بننا بھی حرام ہے۔۔۔ بظاہر ان الفاظ میں بے پناہ تلخی محسوس ہوتی ہے۔
مگر کیا یہی حق نہیں؟

امام احمد رضا پر کفر سازی کا اہتمام رکھنے والے کیا قرآن کو بھی جھٹلا دیں گے۔! شاید یہ حضرات
یہ بھی کہ گزریں علامہ اقبال نے بڑی سچی بات کہی ہے
خود دید لے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں۔

قرآن عظیم میں بیس سے زیادہ آیات ہیں اے (یعنی کافروں سے وداد و اتحاد کو)
مردود و ملعون فرما چکا۔ اور باججا صاف ارشاد فرما دیا کہ ایسا کرنا تو
انھیں میں سے ہیں۔

وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ راورم میں جو کوئی ان سے دوستی رکھیں
وہ انھیں میں سے ہے، ایسا کرنا تو مسلمان نہیں لاجحد قومًا یؤمنون
باللہ والیوم الآخر یؤادون من حاد اللہ ورسولہ۔

اسی طرح مشرکین کا حلیف بننا۔ انھیں اپنا حلیف بنانا (حلالہ حلیف بنانا منسوخ
ہو چکا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ لَا تُحَدِّثُوا فِي
الْإِسْلَامِ حَلْفًا اب اسلام میں کوئی حلف پیدا نہ کرو)

رب عز وجل فرماتا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا
دِينَكُمْ هُذُودًا وَلَعِبًا مِّنَ الَّذِينَ أَوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ
الْكَفَّارَ أَوْلِيَاءَ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ كُفْرَكُمْ مُؤْمِنِينَ۔

اے ایمان والو! جو تمہارے دین کو ہنسی کھیل سمجھتے ہیں۔ جنھیں تم سے پہلے کتاب
دی گئی اور باقی سب کافر۔ ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرو اگر تم مسلمان
رہنا چاہو۔

رسائل رضویہ ۱۵۲

مولانا اشرف علی تھانوی کی گواہی
آگے پڑھنے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس
موضوع پر مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی ایک
عبارت بطور شہادت پیش کر دوں تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ جملہ الزامات اہلسنت و جماعت کے
اختراع ہیں۔ فرماتے ہیں۔

خصوصاً ان پر زیادہ افسوس ہے کہ جو مسلمانوں کے راہبر اور مقتدا کہلاتے ہیں
اور جن کے ہاتھ میں انکی تکمیل ہے جو ان کی کشتی کے ناخدا بنے ہوئے ہیں
جو ان کے سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ وہ ان کے لیڈر ہیں۔ لیکن ایسے لوگ
کیا رہبری کرینگے جب خود کم کردہ راہ ہیں تو دوسروں کو کیا راہ بتاینگے۔ انھوں نے
کافروں کی چکنی چپڑی باتوں میں اگر مسلمانوں کو پسوا دیا۔ اور مسلمانوں ہی کو کیا
خود بھی ان چیزوں کا ارتکاب کیا جو ایمان اور دین کو خراب اور برباد کرتی ہیں
جسے کہ غرے لگائے۔ پیشانیوں پر قشے لگائے۔ ہندوؤں کی تحفیلوں کو

کندھا دیا رام لیلاد وغیرہ کا انتظام مسلمان و النشریوں نے کیا سیودہ اور کفریہ کلمات زبان سے کہے کہ اگر نبوت ختم نہ ہوتی تو فلاں ہندو نبی ہوتا
(افاضات الیومیہ حصہ ششم ص ۲۰۲)

امام احمد رضا فرماتے ہیں

ان باب میں حیرت تو ان نام نہاد موحیدین علماء پر ہے کہ جعفریوں نے اہل اللہ بلکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) سے استعانت کو نہ صرف یہ کہ بلکہ کفر اور اس سے بھی آگے شرک تک قرار دیا ہے اور جس سے ان کی خود ساختہ "توحید خاص" مجروح ہوتی ہے۔ وہی حضرات کبھی انگریزوں سے استعانت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی ہندوؤں سے... لہذا اوقات یہ حضرات اپنی توحید خاص کو جملہ دیگر مسائل کے اس طرح پیٹ کر رکھ دیتے ہیں کہ ہوا تک نہیں لگتی "مسلمانوں سے وداد و محبت کے بجائے نفرت کرتے ہیں اور ہندوؤں یا رانہ گانٹھتے ہیں۔ پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں

امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے وہی بات فرمائی جو قرآن عظیم کا ارشاد ہے!

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ خَبَا لَا ذَرَّةَ
مَاعَيْنَكُمُ قَدْ بَدَلَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَقْوَابِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ
أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ (اے ایمان والو اپنے غیروں
کسی کو راز دار مت بناؤ وہ تمہاری بدخواہی میں درگزر انکی دلی مٹا ہے تمہارا شفقت میں پڑنا
و غمی انکے موبوں سے ظاہر ہو چکی ہے۔ اور وہ جو انکے سینوں میں دبی ہے وہ بڑی ہے
بیشک ہم نے تمہارے سامنے نشانیاں صاف بیان فرمادیں اگر تمہیں عقل ہو)
قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: بَشِّرِ الْمُنَافِقِينَ بِأَنَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا الَّذِيْنَ يَتَّخِذُونَ
الْكُفْرَيْنَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ أَلِيَّتُهُمْ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةُ
فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا۔ (اے محبوب خوشخبری

سناؤ منافقین کو کہ انکے لئے دردناک عذاب ہے۔ وہ جو مسلمانوں کے سوا کافروں کو
دوست بناتے ہیں۔ کیا انکے پاس عزت و مہر نہ تھے میں عزت تو ساری خدا کے قبضے میں ہے)

قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ
الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ۔
(مسلمان مسلمانوں کے سوا کافروں کو مددگار نہ بنائیں اور جو ایسا کر لیا اُسے اللہ سے
کچھ علاقہ نہیں)

حاصل یہ کہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ اور انکے خدام نیز علمائے کرام اور مشائخ عظام کی کثیر تعداد
نے تحریک ترک موالات "متحدہ قومیت" پر سر حاصل بحث کی ہے اور ناقابل تردید حقائق
و شواہد سے ثابت کر دیا ہے کہ "تحریک ترک موالات" مسلمانوں کے مذہبی، ملی قومی اور
سیاسی تشخص و بقا کیلئے ہلاکت آفرین تھی۔

مقام بندہ مومن کا ہے درائے زین سے تا یاتمام لات و منات

جھوٹ کا تعاقب

یہ عجیب بات ہے کہ ان سطور کے لکھنے کے دوران میں "روزنامہ
جنگ لاہور" میں جناب محمد فاروق صاحب قریشی کا ایک مضمون
بعنوان "عقیدہ یا سیاسی حکمت عملی" قسط وار نظر سے گذرا جس میں جناب محمد فاروق صاحب نے
"دوقومی نظریہ" جناب سر سید احمد خاں کے "خیالات و نظریات" اور "متحدہ محاذ" پر خاصی
معلومات افزا بحث فرمائی ہے۔ اور اس ضمن میں "سر سید احمد خاں" کی انگریز دوستی کا
خاص تذکرہ کیا ہے۔

مگر چند ایک باتیں ایسی بھی کہی ہیں جو سر سر غلط اور بہتان ہیں۔ اس باب میں ہمارا خیال یہ
ہے کہ قریشی صاحب جان بوجھ کر امام احمد رضا علیہ الرحمہ پڑھندوں سے اشتراک "کا الزام لگایا
ہے تاکہ بعد والوں کیلئے "بطور سند" کام آئے۔ بہر صورت اس طویل بحث سے ہم ایک
نقص سا اقباس درجہ کرتے ہیں۔

اب سر سید کے دن رات کانگریس کی مخالفت میں صرف ہونے لگے تاکہ ہندوستانیوں
کے اتحاد سے برطانوی مفادات کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ انہوں نے مسلمانوں کو
کانگریس سے دور رکھنے کیلئے ایٹری چوٹی کا زور لگایا۔ کانگریس میں داخلہ کو حرام

اور کفر قرار دیا اور جواز یہ نکالا کہ اس جماعت میں ہندو کی شمولیت کے باعث مسلمانوں کا داخلہ جائز نہیں ہے۔ چنانچہ سر سید احمد خاں کے خلاف علمائے ہند نے ایک فتویٰ جاری کیا جس پر تمام مکتبہ فکر کے علمائے دستخط کئے اس فتویٰ کی رو سے کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت کو جائز مقرر کیا گیا۔

مولانا احمد رضا خان بریلوی نے بھی کانگریس میں شمولیت کی حمایت میں فتویٰ جاری کیا جسکا متن حسب ذیل ہے !

ماہنود زمانہ سے معاملہ کرنا تحقیق شریعت جائز ہے خصوصاً اس معاملہ میں اخص شریک کرنا جس میں رفاہ عام نفع انام و حفظ حقوق و مروت مخلوق ہو کہ اس میں خاص اخص کا نادرہ نہیں اہل وطن کا نفع ہے ایسی جماعت میں شامل ہونا جائز ہے۔

ع ۱۔ سید احمد (سر سید احمد خاں) زبانی دعوئے اسلام کرتے ہیں حقیقت میں دام در سبتر استین ہیں ان کا زہر آلود فصول انجام کار لوگوں کو ہلاک کر دیگا۔ اس لئے ان کے ساتھ ملنا شرعاً جائز نہیں (دستخط امام طبقہ علمائے بریلوی مولانا احمد رضا خان بریلوی، ۱۰ ربیع الاول ۱۳۵۶ء)

سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کو جن وجوہات کی بنا پر کانگریس میں شامل ہونے سے روکا تھا۔ مولانا احمد رضا خاں نے اپنے فتویٰ میں ان سب کی ایک ایک کر کے تکذیب کر دی ہے اور مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہو کر ہندوؤں کیساتھ شریک کر دے جو جدوجہد کو از روئے اسلام جائز قرار دیا ہے۔ اس غیر مبہم اور واضح فتویٰ سے بریلوی مسلک کے اصحاب علم پر اہم فریہ داری عائد ہو جاتی ہے جس سے سبکدوشی ان کا اولین فرض ہے کیونکہ دو قومی نظریہ کو عقیدہ کا درجہ مولانا عبد الستار خاں نیازی نے دیا ہے (جنگ لاہور ۲ جنوری ۱۹۸۲ء)

قریشی صاحب اپنے اس مضمون کی روشنی میں کٹر کانگریسی معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں یہ بحث نہیں کہ سر سید احمد خاں کیا تھے اُن کے عقائد و نظریات کا رخ کیا تھا اور وہ

کس درجہ کے انگیز پرست واقع ہوئے تھے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی امام احمد رضا علیہ الرحمہ اور اُن کے رفقاء کرام نے کانگریس میں شمولیت کا فتویٰ دیا تھا۔ اور کانگریس کی حمایت کی تھی؟ تو یہ فتویٰ قریشی صاحب کا خود ساختہ ہے۔ حیرت ہے کہ قریشی صاحب اس جھوٹ پر ذرا بھی نہیں جھجکے۔ روزنامہ جنگ لاہور سوموار ۵ اپریل ۱۹۸۲ء میں چھپنے والا یہ مضمون انتہائی گمراہ کن ہے یہاں لعنة اللہ علی المذنبین کے علاوہ صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ قریشی صاحب اُس فتویٰ کی فوٹو سٹیٹ شائع کریں یا کوئی ایسا دستاویزی ثبوت مہیا کریں جو ہمارے لئے قابل قبول ہو۔ غالباً قریشی صاحب کا مطمح نظر یہ ہے کہ وہ خود تو دُوبے میں قسم تم کو بھی لے ڈیٹے۔ قریشی صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ

یونا بونا پتہ پتہ حال ہمارا جانے ہے جانے نہ جاتے گلی ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

مولانا تھانوی کو کیا کہنیے میں سوچ رہا ہوں کہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ پر کفر سازی کا الزام لگانا تو لے مولانا تھانوی کو کیا کہنیے۔ اتنی بڑی بات تو امام

احمد رضا علیہ الرحمہ نے بھی نہیں کہی تھی جتنی بڑی بات مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے نہایت سادگی سے کہہ ڈالی ہے اس موقع پر مجھے اُغصین کی ایک گفتگو یاد آتی ہے۔ آپ نے فرمایا ہے

تربیت و اصلاح کا کام بڑا نازک ہے اس میں بڑے ماہر فن کی ضرورت ہے اسی لئے میں کہتا ہوں کہ شیخ کامل ہونا، قطب ہونا، غوث ہونا ضروری نہیں ماہر ہونا ضروری ہے۔ بدوں اسکے اصلاح و تربیت نہیں کر سکتا۔

پھر ایک سوال پر فرمایا کہ شیخ کا متقی، پرہیزگار، زاہد عابد ہونا بھی ضروری نہیں جیسے طیب جسمانی کہ وہ خود کیسا ہی بد پرہیز ہو لیکن ماہر فن ہو۔

(الافاضات الیومیہ جلد ہشتم ج ۱ اول ص ۵۵)

یہاں ہم یہ بحث نہیں کرنا چاہتے کہ واقعہ شیخ کو کیا ہونا چاہیے۔ پرہیزگار ہونا چاہئے صرف فنکار ہونا ہی کافی ہے!

البتہ مجھے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مولانا تھانوی یقیناً بہت بڑے ماہر فن تھے اور اُسے علم و ادب کے فنکار تھے حسب ذیل عبارت کے بغور مطالعہ کے بعد مجھے یقین ہے کہ آپ بھی اسی

پورے (مردمان فکارتی کے)

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ زمانہ تحریک خلافت میں کیا رہ جانا ہو۔ ایک مولوی صاحب تحریک خلافت میں بڑی سرگرمی سے کام کر رہے تھے۔ مجھ سے ملنے آئے منطقی اور معقولی آدمی تھے۔ انہوں نے مجھ سے ان مسائل کے متعلق ایک سوال کیا میں نے جواب کے سلسلے میں کہا کہ منطقی قاعدہ ہے کہ ”مرکب ادنیٰ اور اعلیٰ سے ادنیٰ ہوتا ہے“ خیس اور نفیس کا مجموعہ خیس ہوتا ہے، لہذا بالکل صحیح ہے میں نے کہا کہ اب میں چوتھا ہوں کہ جو جماعت مرکب ہو مسلم اور کافر سے وہ مسلم جماعت ہوگی یا کافر کہ کافر میں نے کہا کہ ترکی سلطنت میں جمہوریت قائم ہو چکی ہے۔ شخصیت نہیں رہی۔ اور وہ مرکب ہے مسلم اور غیر مسلم سے تو وہ اسلامی سلطنت ہوئی یا کیا۔ کہا کہ غیر مسلم سلطنت ہوئی۔ میں نے کہا شرعی اصول و قواعد سے جب وہ اسلامی سلطنت بھی نہ رہی اور خلافت تو بڑی چیز ہے تو پھر اس کی نصرت کسی الخ

(افاضات الیومیہ جلد ہفتم جز اول ص ۱۷)

بہر صورت تھانوی صاحب نے انہیں جواب کرنے کے بعد فتویٰ ہی دیا کہ ترکی کی مدد کرنی واجب ہے وہ اس سے کہ دشمن تو اسلامی ہی سمجھتے ہیں۔ اسکے بعد وہ مولوی صاحب خوش ہو گئے اور دو درپے ندانہ بھی پیش کئے جو بطیب قلب قبول کر لئے گئے۔

بیان کردہ قاعدے اور کلیہ کے تحت آپ بھی غور فرمائیں کہ کیا نتیجہ لگا لاجائے مثلاً ”جو جماعت مرکب ہو مسلم اور کافر سے وہ مسلم جماعت ہوگی یا کافر“ آپ سوچئے کہ جو جماعت مرکب ہو۔ لانا مدنی اور گاندھی سے وہ مدنی جماعت ہوگی یا گاندھی؟

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ جو کلیہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ ”مرکب ادنیٰ و اعلیٰ سے ادنیٰ ہوتا ہے“ خیس اور نفیس کا مجموعہ خیس ہوتا ہے“ درست ہے مثلاً پاک اور ناپاک کا مرکب ناپاک ہی بنے گا۔ باقی آپ خود ہی سوچ لیں۔

ہم اگر عرض کرینگے تو شکایت ہوگی۔

تحریک ہجرت

دور جنوں

بلاشبہ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۲۰ء تک کا دور مسلمان برصغیر کیلئے انتہائی خطرناک اور بھیانک دور کہا جاسکتا ہے۔ ان ماہ و سال میں مسلمان دہما اگرچہ انتہائی پُر جوش اور متحرک نظر آتے ہیں خصوصاً تحریک خلافت نے تو انہیں شعلہ بدلاں کر دیا تھا۔ مگر تاریخ کے گہرے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ عرصہ دراز تک مسلمانوں کی سیاسی قیادت صحیح منزل کا تعین نہیں کر پائی تھی۔ اور نہ ہی انہوں نے اپنے لئے کوئی واضح راستہ متعین کیا تھا۔

جوش و جذبات کا ایک طوفان تھا جو امنڈ اچلا آ رہا تھا۔ اور اسکی لپیٹ میں آتیوالی کوئی چیز سلامت نہ رہ سکی اگر اسے ۱۸۵۷ء کا رد عمل کہا جائے تو یہ کچھ غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کو جن دردناک حالات سے گزرنا پڑا اور جو کاری زخم برداشت کرنے پڑے تھے اسی کسک ابھی باقی تھی۔

اب جب کہ گاندھی نے مسند خلافت میں اشتراک عمل کا اعلان کیا تو مسلمانوں کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خوں شعلہ بن گئے ”متحدہ قومیت“ کا نعرہ لگا اور جذبات کی لے پناہ لہروں نے فراست کے سینے کو ڈبو دیا۔ اوپر ہر طرف گاندھی ہی گاندھی نظر آنے لگے۔

میں اپنے آپ کو یہ کہنے میں حق بجانب سمجھتا ہوں کہ اس دور میں اکثریت کے سیاسی غلبہ کی وجہ سے مسلم قیادت مغلوب ہو کر رہ گئی تھی مسلمانوں کے طرز فکر میں نمایاں تبدیلی کا اظہار ہو رہا تھا۔ مشرکین سے گہرے ارتباط و تعلقات کی وجہ سے ذہنی انحطاط کا شکار تھے۔ بلکہ بحیثیت مسلمان کے کچھ سوچ ہی نہیں رہے۔

ان کے دل و دماغ پر گاندھی کے فلسفہ کی بڑی گہری چھاپ تھی اور وہ صرف ”ہندوستان اور ہندوستانی“ اور ”ہراوران وطن“ کا محدود تصور تھا اور بس

اسلام کے آفاقی لفظ نظر کا کہیں سراغ نہیں ملتا تھا۔ اس کے بہت بعد مصر کے انقلابی لیڈر جناب سعد زناہ نے بھی اسی قسم کے نعرے لگائے تھے اور وقتی طور سے ”قوم کے ہیرو“ بن گئے تھے۔ ”ہم فراعنہ کے بیٹے ہیں“ ”ہم عرب کے بیٹے“ اور ”مرفر زناہ“

ہیں وغیرہ وغیرہ جن سے وحدت ملی کی بنیادیں بکھر کر رہ گئیں۔ نتیجہ آج بھی عرب پاش پاش ہیں بہ صورت اس دور جنوں میں بہت سی انہونیاں ہوئیں جو ہنس ہونی چاہئے تھیں۔

ہلاکت آفریں کلمات

• مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد ناگپور کے جمعہ کے خطبہ اول میں مسٹر گاندھی کی تعریف تو صیغہ فرمائی (اخبار مشرق گورگھپور ۱۲ جنوری ۱۹۲۱ء)

• جمعیت علماء ہند (دہلی) کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے (مولانا شوکت علی مرحوم) نے فرمایا۔ اے اللہ ہم سے ایک نیک کام بھی ہو گیا ہے یعنی میں تمہا تما گاندھی یقینی بھائی بھائی ہو گئے ہیں۔ اور یہ محبت میں نے جان بوجھ کر بڑھائی ہے (اخبار فتح دہلی ۲۴ نومبر ۱۹۲۱ء)

• رفاه عام لکھنؤ کے جلسہ میں مولوی ظفر الملک اسحاق علی نے فرمایا "اگر نبوت ختم نہ ہو گئی ہوتی تو مہاتما گاندھی نبی ہوتے"

(اخبار اتفاق دہلی ۲۴ اکتوبر ۱۹۲۱ء) ہر سولے ساؤڈاز تحریک آزادی ہند اور اسواد الاعظم (۱) حاصل یہ کہ ہندو اور ہندو لیڈر جو چاہتے تھے وہی ہوتا تھا اور مسلمان انکے ہر شاہے پر "مہر و چشم" اور "مہر و چشم" سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔

مثلاً گاندھی کے حکم سے ستیگرہ کے دن روزہ رکھا گیا۔ • وید کو الہامی کتاب تسلیم کیا گیا۔ • کرشن کو حضرت موسیٰ کا لقب مان لیا گیا۔ • ہندو کی طرف سے یہ تجویز آئی کہ مسلمان رام لیلا منائیں اور ہندو محرم (چنانچہ ہندوؤں نے تو محرم نہیں منایا البتہ مسلمانوں نے رام لیلا کا بندوبست کیا)

• اللہ کو رام کہا گیا سنگھ بجا گیا۔ • مسجدوں میں ہندوؤں کی تقریریں کروائی گئیں۔ • رام لچھن پر پھول چڑھائے گئے۔ • رامائن کی پوجا میں شرکت کی گئی۔

اور حد یہ ہے کہ دیوبند کے شیخ الہند کا ارشاد ہوتا ہے۔

کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نے آپ کے موطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے

حصول کینے موید بنا دیا ہے اور میں ان دونوں قوموں کے اتفاق کو بہت متنبہ اور متوجہ سمجھتا ہوں

(علمائے حق حصہ اول (محمد میاں))

اگر غور فرمایا جائے تو یہ بات نہایت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ جناب شیخ الہندؒ کیا فرمایا چاہتے ہیں۔

• ہمیں مولانا کی عبارت سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ہمارے ساتھ ہندوؤں کا اشتراک عمل حق تعالیٰ جل شانہ اور ان مشرکین دونوں کا احسان ہے کہ ہمیں ناشکری نہ کر بیٹھنا، کیونکہ یہ اشتراک (مومن و مشرک) بڑا نتیجہ خیز ثابت ہو گا!

اور اس نتیجہ خیزی کو مولانا اشرف علی تھانوی سے سنئے۔

ادھر حکومت کے معاملہ میں مسلمانوں کو آگے کر دیا۔ اور بعض بد فہم اور بے سمجھ مسلمانوں کے جو راہبر تھے انکو ہٹا پھسلا کر ہجرت کا سبق پڑھایا۔ ادھر شدھی کا مسئلہ جاری کر دیا غرض کہ ہر طرح مسلمانوں کے جان، مال، جائیداد، مال زر، زمین گھر سب کا مالک اپنی قوم کو بنانا چاہتا تھا۔ یہ بھی اسلام اور مسلمانوں کیساتھ اسکی خیر خواہی اور ہمدردی لیکن یہ لیڈر نہ سمجھے اور نہ ان کے ہم خیال مولوی

(افاضات الیوم حصہ ششم ص ۳۰۵)

کاش یہ حضرات ہندوؤں کی سازش کو سمجھ سکتے۔ اور مومن کی فراست سے کام لیتے تو آج ہم بہت آگے ہوتے۔ جس قوت کو ہندوؤں کے بناؤ اور اپنی بگاڑ پر خرچ کیا اگر صرف قومی نقطہ نظر سے ملت کے سنوارنے پر خرچ کبی جاتی تو صورت حال زیادہ اچھا نتیجہ دیتی۔

"تحریک خلافت" نے کئی روزہ خیز تحریکیں بھی جنم دیں جن سے سامراجیوں اور ہندوؤں نے کھربوں فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کے لئے پٹے تافلے کی زبوں حالی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔

تحریک ہجرت کی کہانی | تحریک ہجرت کی کچھ داستان جناب پروفیسر احمد سعید صاحب کی زبانی سنئے۔ اپنی کتاب حصول پاکستان میں تحریک ہجرت

اشرف علی تھانوی

کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

اس زمانہ میں ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالباری ندوی نے ہندوستان سے ہجرت کا فتویٰ جاری کیا مولانا عبدالباری نے ہجرت کے متعلق جو اعلان کیا وہ اخبار خلافت یکم مئی ۱۹۲۲ء سے نقل کیا جاتا ہے۔
ہجرت کے متعلق یہ عرض کرتا ہوں کہ وہ تمام مسلمان جو اپنے ضمیر، قلب یا کان کو مطمئن نہیں کر سکتے وہ اب اسلام کے احکام کے متعلق عمل پیرا ہوں وہ اس ملک سے ہجرت کر کے ایسے مقام پر چلے جائیں جہاں اسلام کی خدمت انجام دینا اور اسلامی قوانین کے مطابق عمل کرنا بہتر طریق پر ممکن ہو اس فتویٰ کا شایع ہونا تھا کہ ہزاروں مسلمانوں نے ہندوستان چھوڑ نیک فیصلہ کیا۔ اور افغانستان کی طرف روانہ ہو گئے۔

صوف ماہ اگست ۱۹۲۲ء میں ۱۵ اپندرہ ہزار مسلمان افغانستان کی طرف چلے گئے ایک اندازے کے مطابق کل مسلمان۔ جنھوں نے افغانستان ہجرت کی انکی تعداد پانچ لاکھ اور بیس لاکھ کے درمیان تھی۔ قاضی عبدالغفار اپنی کتاب حیات اجمل میں لکھتے ہیں۔ شروع میں تو ہجرت کی تحریک نے ایسا اثر پیدا کیا کہ ترک موالات کی تحریک بھی اسکے مقابلے میں ماند پڑ گئی۔

افغانستان کی حکومت کے دس سال محدود تھے، تخی بڑی تیز رفتاری سے پھیلنے اور رہائش کا بندوبست اسکے بس سے باہر تھا۔ چنانچہ افغانی حکومت نے اپنے دروازے بند کر دیے چنانچہ مجبوراً مسلمانوں کو واپس آنا پڑا جسکا نتیجہ نیکلا کہ ہزاروں مسلمان جو پہلے ہی تکالیف و مناسبات برداشت کر کے افغانستان پہنچ پائے تھے۔ انکو دوبارہ پیاس اور بھوک کا سامنا کرنا پڑا۔

تحریک ہجرت ایک جذباتی تحریک تھی جس سے مسلمانوں کو حیدر نعیمان پہنچا۔ بقول سید حسن ریاض (مصنف پاکستان ناگزیر تھا) یہی ایک قدم تھا جو مسلمانوں نے بے سوچے سمجھے اٹھایا۔ قاضی عبدالغفار اپنی کتاب (حیات اجمل

میں) تحریک کے بارہ میں یوں رقمطراز ہیں۔

یہ تحریک سیاسی حیثیت سے ناقص تھی حکیم اجمل خاں اس تحریک سے سب سے زیادہ غیر مطمئن تھے ان کی رائے میں ترک وطن ہی کی تحریک ہر طرح سے وطن پرستی کی نفی تھی۔

وہ کہتے تھے کہ آزادی کی جنگ وطن ہی کی سرزمین پر لڑی جانی چاہئے۔ چند روز ہی بعد اس غلط تحریک کی غلطی کا لوگوں کو احساس ہوا۔ اور مہاجرین کو سخت مچھائب کا سامنا کرنا پڑا۔

(حصول پاکستان ۱۳۲۰ء)

نہ خدا ہی ملانہ وصال صتم
بہر صورت ہر مؤرخ یہ لکھنے پر مجبور ہے کہ تحریک ہجرت بالکل غلط تحریک تھی جسکی ہلاکت آفرینی سے کوئی دیا نند اہل قلم انکار نہیں کر سکتا۔ اور یہ صورت حال اسلامی نقطہ نظر سے بھی مخدوش تھی اس دور میں بھی سرگرمی ہی عقل کل نظر آتے ہیں۔ اور وہ مسلمان لیڈروں کو جو سبق پڑھا ہے تھے انتہائی خطرناک تھے۔ اس دور میں اسلامی تشخص اور شعائر اسلام کو پامال کیا جا رہا تھا مگر مسلم قیادت بے خبری بلکہ بے خبری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ نہیں کہا جاسکتا کہ آخر کیوں! اور تحریک ہجرت کے باب میں جناب رضی جیدہ تحریر فرماتے ہیں۔

ہندوستان کی تاریخ میں یہ دور بڑا پر آشوب دور ہے کیونکہ اس دور میں مسلمانوں کو اپنے غلط فیصلوں کی بنا پر شدید جانی، مالی اور ذہنی نقصانات اٹھانے پڑے

ترک موالات نے انکو نہ صرف تعلیمی اداروں اور ملازمتوں سے محروم کر دیا تھا۔ بلکہ ہجرت کے اعلان کے بعد وہ شدید مشکلات میں گھر کر رہ گئے۔ افغانستان کی جانب ہجرت کرنے والوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ تو سفر اور دشوار گزار راستوں کی صعوبتیں برداشت نہ کر کے موت کا شکار ہوئے۔ جو افغان خیر ال افغانستان کی سرحد پر پہنچے۔ انھیں افغانی حکومت نے ملک میں

داخل ہونے سے روک دیا۔ کیونکہ اول تو افغانستان اور حکومت برطانیہ میں معاہدہ ہو گیا تھا اور وہ اپنے حلیف کی حکومت سے ہجرت کرنے والوں کو پناہ دے کر حکومت برطانیہ سے تعلقات خراب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ دوسرے اس مسئلے کا اقتصادی پہلو بھی تھا قیام اور روزگار کا مسئلہ حل کرنا افغانستان جیسے پسماندہ ملک کے بس کی بات نہیں تھی۔

(قائد اعظم کے بہتر سال ۱۹۶۹ء)

مجدد وقت کا اظہار حق ان حالات میں ایک ایسی عبقری دہمگیر صاحب بصیرت جو ائمہ شخصیت کی ضرورت تھی جوان دبیز تہ درتہ تاریک پردوں کے اندر جھانک سکتی۔ کوئی ایسا مرد من جسکی فہم و فراست۔ دہل و فریب کی دھجیاں کھیر سکتی اور مسلمان خود اپنی بقا کی جنگ کرتے اور ہندوؤں کی سرپرستی قبول کرنے سے انکار کر دیتے۔ اور پھر وہ مرد درویش، مرد جری، امام احمد رضا کی شکل میں میدان میں آیا۔ اور برہمنی سازش کے تار پوک کھیر دیا ۱۸۹۶ء میں پٹنہ کے عظیم الشان اجتماع میں سب سے پہلے ”ہندو مسلم اتحاد اور ایک قومی نظریہ“ کی بنیادیں اکھیر دیں۔ یاد رہے کہ منجملہ دیگر اعتراضات کے علما نے اہلسنت پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ انہوں نے تحریک ہجرت کی مخالفت کی اور اس کے ساتھ یہ فرمادیا کہ ”یہ انگریزوں کے ایجنڈے تھے“

حق یہ ہے کہ اس باب میں امام احمد رضا اور ان کے رفقاء کا موقف بالکل واضح اور غیر مبہم رہا ہے۔ اور آج بھی انکا نقطہ نظر وہی ہے جو پہلے تھا۔ کہ برصغیر ہند میں رونما ہونیوالی تحریک ہجرت سراسر ناروا اور غلط تھی امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے علی الرغم جملہ رہنمایان ہندو شرعی، عقلی، سیاسی، سماجی اور معاشی و اقتصادی دلائل سے ثابت کر دیا تھا کہ یہ ہجرت شرعاً ہجرت نہیں اور ہر اعتبار سے ہلاکت خیز اور فحاشی آفریں ثابت ہوگی۔

جس کی وجہ سے مخالفت کیمپ میں زلزلہ طاری ہو گیا۔ اور ناروا الزامات کے طوفان برپا کر دئے گئے۔ اس تحریک ہجرت کے سلسلے میں امام احمد رضا ”الحجۃ المومنہ“ میں تحریر فرماتے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ میرا کلام بعض برائے کا اور حسب معمول تحقیق حق اور اظہار احکام رب انام کا نام گالیاں دکھا جائیگا۔ ہمیشہ عاجزوں نے اپنا عز و دل ہی چھپایا ہے احکام حق کو سختی بنا کر گالیاں بٹھہرا کر جواب حق سے گریز کا حیلہ بنایا ہے۔ لہذا دست بستہ معروض کہ حقوڑی دیر نیچری تہذیب سے نیچے تنزل فرما کر وہ آئیں کہ شروع فتویٰ میں تملات ہوئیں۔ ان پر ایمان لاکر ان مباحث علمیہ اور احکام الہیہ کو بغور سن لیجئے۔ اگر بالفرض باطل ہماری غلط فہمی ہے حق و انصاف سے بتا دیجئے ہمیں بحمد اللہ ہرگز وہ نہ پلٹے گا۔ جو سمجھ لینے کے بعد باطل پر اصرار حق سے انکار۔ نارحق پر عار اختیار کر رہے ہیں۔

(الحجۃ المومنہ (مسائل رضویہ ص ۱۹۶)

سطور بالا میں غور فرمائیے۔ اور انصاف سے بتائیے کہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے متعلق کتنا غلط اور افسوسناک پروپیگنڈہ کیا جا رہا تھا (جواب بھی پورے شد و مد سے جاری ہے) آپ فرماتے ہیں کہ مجھے قرآن و سنت کی روشنی میں دلائل و براہین سے قائل و مطمئن کیا جائے میں ہر وہ اچھی بات جو احکام الہیہ کے مطابق ہوگی تسلیم کروں گا۔ مگر امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے ان واضح ارشادات کے باوجود انکے خلاف حماز آرائی جاری رہی۔ آپ فرماتے ہیں۔

ہجرت کا بھرا دیا گیا کسی طرح یہ دفع ہوں ملک ہماری کینڈیاں کھیلنے کو بھجائے یہ اپنی جانداویں کوڑیوں کے مول بیچیں یا لیں ہی چھوڑ جائیں بہر حال ہمارے ہاتھ آئیں۔ انکی مساجد و مزارات اولیا ہماری پامالی کو رہ جائیں۔

(مسائل رضویہ ص ۲۰۰)

یہ بات بالکل درست ہے کہ مسلمانوں کی تحریک ہجرت گاندھی جی کے زرخیز ذہن کی پیدوار تھی انہوں نے اپنے ہمنوا علمائے کرام کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ”اب مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ افغانستان کی طرف ہجرت کر جائیں“ اور ان حضرات نے فتویٰ لکھ مارا اور ہجرت شروع ہو گئی۔ مگر خود ان لوگوں کا کردار کیا رہا امام احمد رضا علیہ الرحمہ کی زبانی سنئے۔

ہجرت کا غل جپایا اور اپنے آپ ایک نہ سرکا۔ جو اُجھانے میں آگئے اُن
مصلحت زدوں پر جو گزری، گزری یہ سب اپنے جو روپوں میں چین سے ہے
(رسائل رضویہ ص ۲)

اور یہ امر واقعی قابل غور ہے کہ تحریک ہجرت کے بانیوں اور ہجرت کے نعرہ بازوں میں سے
چند ایک کے علاوہ ایک بھی قابل ذکر فرد نے ہجرت نہیں کی (دو تین بڑے لوگ جو گئے انکی مصلحت
اور بھی نہ کہ ہجرت)

ہجرت کرنے والوں میں اکثریت اُن سادہ لوح مسلمانوں کی تھی جن کے سینے اقوام شریعت
کی آماجگاہ تھے اور جو ان رہنمایان دین و ملت کی باتوں پر بھرپور یقین رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک
مقام پر امام احمد رضا علیہ الرحمہ ان مسلم قائدین کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اور بغرض غلط اور بغرض باطل، اگر سب مسلمان زمینداریاں، تجارتیں، نوکریاں
تمام تعلقات یکسر چھوڑ دیں تو کیا تمہارے جگہری غیر خواہ جملہ ہندو بھی ایسا ہی کرینگے
تمہاری طرح زے ننگے بھوکے رہیائے گئے؟ حاشا ہرگز نہیں، زہنا رہنہیں
(رسائل رضویہ ص ۲)

ہمیں اس مقام پر غیر متعصبانہ طور پر سوچنا پڑے گا کہ اگر ہجرت والی فرنگی دہرہ بنی سازش کامیاب
ہو جاتی تو برصغیر میں مسلمانوں کا مستقبل کیا ہوتا۔ کیا پورے انڈس میں جو کھیل تلواروں اور سازشوں
کے بل بوتے پر کھیلا گیا وہی کھیل گاندھی اور اسکے ہم نوا برصغیر میں کھیلنا نہ چاہتے تھے۔
کیادہ سرزمین جس کو علی ہجویری - مین الدین چشتی اور دیگر اولیائے کرام جہم اللہ تعالیٰ عنہم
کی سرزمین ہے یوں بے یار و مددگار چھوڑ دی جاتی؟

کیا اس تاریخی حقیقت سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ وہاں بھی بے ضمیمہ علماؤں اور رہنماؤں
نے درہم و دنیا کے بدلے ضمیمہ فروشی کی تھی اور یہاں بھی تقریباً یہی صورت حال تھی۔ ہم آگے
چل کر بتائینگے کہ کن کن حضرات نے کہاں کہاں سے استفادہ فرمایا تھا اور فرمایا ہے ہیں
یعنی عہدہ دند کے دند سے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

یہاں ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ تمام مسلمان قصداً اُس سازش میں شریک تھے یا اُن میں

اخلاص کی کوئی کمی تھی بلکہ بہت سے رہنما ایسے بھی تھے جنکا ہر عمل اخلاص پر مبنی تھا اور حالات
کو سمجھتے ہی وہ کانگریس سے جدا ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنی غلطیوں کا کفارہ بھی ادا کیا
ایسے لوگوں کیلئے ہم زیادہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت اُس وقت اُنکے سوچنے کا انداز صحیح نہیں تھا
مگر کچھ علما، اور انکے متبعین اور کچھ پڑھے لکھے دانشور کہلانیا لے حضرات جن پر ملت
کی بے شمار ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں انہوں نے علم و معرفت کے باوجود بیجا ہٹ دھرمی اور
خند سے کام لیا۔ اچھا نہیں کیا۔

بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اُن حضرات کی سوچ پاکستان میں رہتے ہوئے بھی وہی ہے جو
تقریباً نصف صدی پہلے تھی تو غلط بات نہیں ہوگی۔ افسوس کہ ارض پاک کے نان نمک
نے اُن کا ذہن نہیں بدلا۔

حاصل یہ کہ چند سالوں کے بعد ہی حالات و واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان رہنماؤں
نے ہندو اکثریت کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی یکسر غلط تھی انکی دوستی انکی چاہت، اُن کا
پیار، اُن کی محبت سراسر فریب اور دھوکا تھا۔ اور صحیح وہی تھا جو امام احمد رضا علیہ الرحمہ اور
اُنکے رفقاء نے قرآن و حدیث کی روشنی میں کہا تھا۔
عہدہ مؤمن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

سچ یہ ہے کہ انگریز اور ہندو دونوں ہی یہ چاہتے تھے کہ مسلمان
تتلوار کون اٹھائیں گے | برصغیر سے نکل جائیں اگر اس شاداب سرزمین پر برٹش حکومت
کو کوئی خطہ تھا تو وہ صرف اور صرف مسلمانوں سے تھا۔ اس کی منطقی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں
نے سالہا سال کی خونریزی و سازش کے بعد مسلمانوں ہی سے برصغیر کی حکومت چھینی
تھی اور اب فطری تقاضا کے مطابق مسلمان ہی اپنی کھوئی ہوئی حکومت لینے کیلئے سر
اٹھا سکتے تھے۔ اور صدیوں کا تجربہ بھی انگریزوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا تھا۔
جیسا کہ خود مسٹر گاندھی نے اپنے انگریز آقاؤں کے نام ایک یادداشت میں اس کی
وضاحت کی ہے۔

میر امزیب آپ سے خصوصیت رکھنے سے منع کرتا ہے میں اپنے ہاتھ آپ

پر کبھی نہیں چلاؤں گا۔ خواہ میرے پاس اتنی طاقت بھی ہو جائے۔ میں خود مصیبت بھیل کر آپ پر فتح پائی امید رکھتا ہوں۔
علی برادران بیشک اپنے ملک و ملت کی حمایت میں تلوار اٹھائینگے۔ اگر ان سے ہوسکا تو

(اخبار تاج جبل پور، نومبر ۱۹۲۰ء، تحریک آزادی ہند اور اسواد الاعظم ص ۱۱۵)

ملاحظہ فرمائیے۔ یہ دورخی (بلکہ دو غلاپن) اس شخص کی ہے جو بیک وقت ہندوں اور مسلمانوں کا قائد کہلاتا تھا جس پر مسلمانوں نے بھرپور اعتماد کیا تھا۔ جسکی اتباع کے فتوے دارالعلوم دیوبند سے جاری ہوتے تھے جس کی خاطر مسلمانوں نے اپنے علماء و مشائخ کی توہین و تذلیل کی تھی۔ جیسا کہ علی برادران باپ کہتے نہ تھکتے تھے۔ بظاہر سڑگاندھی نے سیاسی زبان و لہجہ اختیار کیا ہے یعنی "علی برادران بیشک اپنے ملک و ملت کی حمایت میں تلوار اٹھائینگے اگر ان سے ہوسکا تو، مگر واقعہ یہ ہے کہ گاندھی نے انگریزوں کو آگاہ کیا تھا کہ علی برادران شمشیر بلف ہو چکے ہیں ہوشیار ہو جائیں۔ اسی طرح اپنا اور اپنی قوم ہندوں کا تحفظ بھی کیا ہے یہی وجہ ہے کہ انگریز مسلسل مسلمانوں کو پامال کر رہے تھے جب کہ ہندوں کی بھرپور عزت افزائی کی جا رہی تھی۔

اور یہاں تو ابھی جنگ حریت ۱۸۵۷ء کے فونی آثار بھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ جنہیں مسلمانوں نے حیرت انگیز جرأت و ہمت اور ناقابل یقین صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اگرچہ انگریزوں نے بے پناہ ظلم و ستم کے ذریعہ وقتی طور پر اس جذبہ بے پناہ کو کچل ڈالا تھا۔ مگر یہ آتش فشاں کسی وقت بھی پھٹ سکتا تھا۔

انگریز اچھی طرح جانتے تھے کہ برصغیر ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں مسلمان ہی وہ واحد قوم ہے جو کسی قیمت پر غلامی قبول نہیں کر سکتی۔ بلکہ یہ قوم تو خود غلام آزاد کرنے کو بہت بڑی نیکی تصور کرتی ہے۔

اور دنیا میں مسلمان ہی وہ واحد قوم ہے جو مذہبی طریقہ پر مساوات و ہمبھائی کا برتاؤ کرتی ہے اور اپنی بیخ ذات پات کا تصور نہیں رکھتی۔

مسلمان وہ واحد قوم ہے جس میں آقا و غلام ایک دسترخوان پر کھاتے ہیں۔ ایک ہی سب میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور صرف مسلمان ہی وہ واحد قوم ہے جسکے سینے میں جذبہ جہاد کا ایک بیکراں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے جو قتل ہونے کو شہادت اور جان دینے کو عبادت اور مہمات کو حیات سمجھتی ہے۔ لہذا اس کو جتنا بے دست و پا کر دیا جائے انگریزوں اور ہندوں دونوں کے حق میں مفید اور سودمند ہوگا اور یہ بڑا کام انگریزوں نے "برادران وطن" ہندوں کے ذریعہ لیا اور مسلمان رہنما ہندوں کے بھڑے میں آگئے۔

• ہندو مسلم اتحاد کے چکر میں گاندھی نے مسلم رہنماؤں کو ہجرت کا چکر بھی دیدیا۔ اور مسلمان چکر کھا گئے۔ اور یہ تک نہیں سوچا کہ گاندھی کا قومی نشان ہی چکر ہے۔ عقل چکرائی اور ہجرت کا اعلان کر دیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان کس لئے ہجرت کریں۔ اور ترک وطن کیوں کیا جائے؟ کیا صرف اس لئے کہ انگریزوں پر دباؤ ڈالا جاسکے۔ اور انگریز اس دباؤ کے تحت برصغیر خالی کر جائیں۔

خدا کی پناہ! اس باب میں اتنی غیر دانشمندانہ حرکت کا تصور بھی اذیتناک ہے۔ بھلا سوچئے تو یہی اس ترک وطن سے مسلمانوں کو کیا مفاد حاصل ہوتا! یہ تو پہلے ہی گھربار خالی کر کے مہاجر ہو چکے ہوتے۔ انکے تعلقات اور ان کی جائیدادیں پہلے ہی فنا ہو چکی ہوتیں۔ پھر انھیں اس دباؤ سے کیا حاصل ہوتا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انھیں اس دباؤ سے کیا حاصل ہوا؟ سوانح بہر صورت ہندوں کیلئے ہوتا۔ وہی اس پورے دھرتی کے مالک کہلاتے انھیں کی راجدھانی آباد ہوتیں۔ انھیں کے مندروں کے کلس چمکتے اور برصغیر کی شاداب وادوں میں انھیں کی جیکار گونجتی۔ اور ہم افغانستان میں پڑے ہوئے۔ پھر کمری محمد بن قاسم اور محمود غزنوی جیسے مجاہدوں کا انتظار کرتے رہتے۔

اور یہ کہ جب انگریزوں کو بدخل کرنے کیلئے "ہندو مسلم" اتحاد تھا تو پھر ہندوں کو بھی اپنے برادران وطن کیساتھ ترک وطن کرنا چاہیئے تھا (جو نہیں کیا گیا) آخر صرف مسلمان ہی کیوں ترک وطن کریں۔ اگر ترک وطن کا دباؤ ہندو اکثریت کی طرف ہوتا تو شاید زیادہ موثر ہوتا۔

اور یہ بھی عجیب بلکہ عجیب تر نظر نہ کر سکتی کہ انگریزوں کو وطن سے نکالنے کیلئے جو یقیناً تاج اور غیر ملکی تھے (خود وطن سے نکل جائیں) یعنی ہجرت کر جائیں) مقصد یہ کہ اگر دشمن کے شر کو شکست دینا ہو تو پہلے خود میدان سے فرار ہو جائے دشمن خود ہی میدان خالی کر جائیگا۔ یہی نہیں بلکہ غور فرمایا جائے تو یہ بھی ظاہر ہو جائیگا کہ انگریز مسلمانوں کی اس "تحریک ہجرت" سے خود کوئی مفاد حاصل کرنا چاہتا تھا۔

دیکھنا یہ ہے کہ اگر برصغیر کے کروڑوں مسلمان جس اسلامی سلطنت کی طرف ہجرت کرتے وہاں کا حشر کیا ہوتا؟ بلاریب وہاں دفعۃً سیکڑوں مسائل پیدا ہو جاتے، سیاسی، معاشی، اقتصادی اور انتظامی مسائل دردناک صورت اختیار کر جاتے اور وہ ملک چند ہی دنوں میں شدید بحران کا شکار ہو جاتا۔

اس وقت یقیناً دنیا میں کوئی ایسی مضبوط اسلامی حکومت نہیں تھی جو اتنی کثیر تعداد مہاجرین کو برداشت کر سکتی۔ بلکہ اگر یہ کہاجائے کہ اس دور میں تقریباً جتنی بھی اسلامی حکومتیں تھیں خود عالم نزع میں تھیں دوسروں کی خبر گیری کیا کرتیں۔

اور ایک تماشہ یہ بھی ہوا کہ رہنماؤں ملت نے مرکز ہجرت افغانستان کو قرار دیا جو اس ترقی کے دور میں بھی انتہائی پسماندہ ہے اور اپنے معاملات میں دوسروں کے سہارے کا محتاج رہتا ہے۔

جہاں آج بھی خشک و سنگلاخ وادیوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے وہاں صنعت و زراعت دونوں ہی کو فروغ نہیں ہے۔ جو اپنی ضرورت کیلئے معمولی سے معمولی چیز بھی پیدا نہیں کر سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر برصغیر کے مسلمان پروگرام کے مطابق افغانستان پہنچ جاتے۔ تو زرد چشم بھیرلوں کو بغیر کسی محنت و کوشش کے ایک نئی شکار گاہ ضرور مل جاتی۔ اور یہی کچھ ہند بھی چاہتے تھے کہ جو کام انکے پرکھوں سے نہ ہو سکا۔ وہ کام انکے ولی نعمت انگریز بہادر کروڑا لاکھ اور محمد ابن قاسم سے لیکر عالمگیر تک کی ردیوں سے اپنا ذہنی انتقام لے سکیں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندو کسی دور میں بھی مسلمانوں کیساتھ مخلص نہیں رہے۔

اور نہ ہی کبھی اس سے اخلاص و مروت کی توقع کی جا سکتی ہے۔

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ علماء کہلانوالا ایک طبقہ کسی بنیاد پر "برادران وطن" اور "مترہ قومیت" کا پروپیگنڈہ کرتا و ہوتا ہے۔ اور وہ کونسی ایسی مصلحت ہے جو مسلمانوں کو چھوڑ کر مشرکوں کی طرف کھینچ رہی ہے۔ جبکہ خدا رسول کے واضح اور صریح احکامات مشرکین سے دوستی و یگانگت کو منع کر رہے ہیں۔

حدید ہے کہ "مسلمانوں کے روشن مستقبل" کے مصنف نے اپنی یہ پوری کتاب شاید ایک کہانی کیلئے وقف کر ڈالی ہے کہ برصغیر میں صرف ایک ہی قوم ہے "ہندوستانی" ہندو مسلم تقریباً ایک ہی ہیں ماضی میں بھی ایک تھے۔ سلطان ٹیپو، سراج الدولہ اور مغلیہ خاندان سے بڑے گہرے روابط تھے بلکہ اصل کار پر داز ہی یہی تھے میں یہ کہتا ہوں کہ اگر یہ سچ ہے تو نتیجہ اُس سے کہیں زیادہ درست ثابت ہوا ہے۔

جیوت رام کا مولانا سدی کو دل شکن جواب ایسا یقینی ہے کہ ہجرت کا شوشہ بھی ہندو نیتوں کی طرف سے ہی چھوڑا گیا تھا۔ جو مسلمانوں کی زبان پر آتے ہی خوفناک تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔ ہندو اس طرز مسلمانوں سے اپنی سات سو سالہ غلامی کا انتقام لینا چاہتے تھے ہندو تلخا یہ نہیں چاہتا تھا کہ مسلمان ہندوستان میں رہ کر آزادی اور سواج میں حصہ دار بن سکے

جنا پنچ دیوبند کی رہنما مولانا عبید اللہ سدی خاں نے فرمایا تھی سناتے ہیں

جس وقت میں ناظم جمعیت الانصار کھامیرے ایک سدی دوست پروفیسر جیوت رام کو بلانی دیوبند تشریف لائے۔ وہ دارالعلوم دیوبند دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک ہفتہ تک میرے مہمان رہے انھیں پوری آزادی سے دارالعلوم کی میر کرانی۔

آخر میں وہ دارالعلوم کی بہت تعریف کرتے تھے کہ ہند کے مستقبل میں جو چیزیں کارآمد ہو سکتی ہیں وہ اس قسم کے کام ہیں۔

اور دارالعلوم کی خدمات قابل تعریف اہمیت رکھتی ہیں اس پر میں نے سوال کیا۔ کہ پروفیسر صاحب ہماری ضرورت ہے یا نہیں؟

اس کا جواب تھا بالکل نہیں۔ اگر آپ ضرورت سمجھیں تو ہمارے ساتھ ہو جائیں
ورنہ ہندو ہمارے۔ اور ہم اپنا کام خود کر لیتے۔ اس جواب کا اثر مجھ پر ظاہر ہے
کہ چھ نہیں ہوا

(نقش حیات جلد دوم ص ۵۷)

افسوس تو یہ ہے کہ اس کی حیرت بھر بھی نہیں ہوئی۔ وہی ڈر تھی اور وہی ڈر ہے۔
یہاں یہ پوچھنا سکتا ہے کیا اس وضاحت کے بعد بھی یہ کہنے کی ضرورت رہ جاتی ہے
کہ ”ہندو کے دل میں کیا تھا“ اور ان کے تاریک دلوں میں مسلمانوں کے خلاف کتنے
خوفناک شعلے دہک رہے تھے۔

حاصل یہ کہ ترک وطن ”ہجرت“ کا شوشہ صرف اور صرف اس لئے پھوڑا گیا تھا کہ
مسلمانوں کے انخلا کے بعد اکھنڈ بھارت کے تصور کو عملی جامہ پہنایا جاسکے۔

جیسا کہ جناب پروفیسر محمد خلیل اللہ صاحب اپنی کتاب ”تحریک پاکستان“ میں
تحریر فرماتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد انگریز مسلمانوں سے انتقام لینے لگا تو
ملک کے ہندو انگریز کی دوستی اور ہمدردی حاصل کرنے کی فکر میں لگ گئے
کوشش یہ ہونے لگی کہ ہر وہ اعزاز و امتیاز جو طویل دور حکومت میں مسلمانوں
کو حاصل تھا ان سے چھین لیا جائے، زمینداری، ملازمت و وسائل
معاش غرض ہر میدان سے مسلمان بیدخل کئے جانے لگے۔

(تحریک پاکستان ص ۳۲)

اور یہی جناب پروفیسر محمد خلیل اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہندو قطعاً نہیں چاہتے
تھے کہ مسلمان کسی طور بھی ہندوستان میں رہیں چنانچہ لکھتے ہیں۔

ڈاکٹر موبخے کا نظریہ ۱۔

جس طرح انگلستان انگریزوں کا ہے۔ فرانس فرانسیسیوں کا اور جرمنی جرمنوں
کا۔ اسی طرح ہندوستان ہندوؤں کا ہے۔ اگر ہندو منظم ہو جائیں تو

وہ انگریزوں اور ان کے پیٹھو مسلمانوں کو مغلوب کر سکتے ہیں
(تحریک پاکستان ص ۱۶۵)

ہر دیال کی وضاحت
اس بات کی جو پروفیسر جیوت رام نے مولانا عبید اللہ سے
کہی اور اس بات کی جو ڈاکٹر موبخے نے بیان کی ”ہر دیال“
وضاحت کرتے ہیں۔

ہمارے درمیان ایسے لوگ بھی ہیں جو بلاوجہ آزادی ہند کی تحریک میں نیم عرب
اور نیم ایرانی مسلمانوں کو بھی شامل کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں خبر نہیں کہ قومی مملکت
اپنی قدیم قومی روایات اور اداروں کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔

اور یہی عناصر مملکت کے باشندوں کو متحد کر سکتے ہیں۔ ہندوستان مسلمان
تو محض ایک غیر متعلق اور غیر ضروری عنصر ہیں
(تحریک پاکستان ص ۱۶۶)

ظفر احمد ایک کی گواہی
جناب ظفر احمد صاحب ایک جو دیوبندی مسک سے
تعلق رکھتے ہیں اور انھیں جناب عبید اللہ مندی سے
شرف تلمذ بھی حاصل ہے۔ اور یہ ہجرت ہی کے سلسلے میں افغانستان ہوتے ہوئے ترکی تک
جا پہنچے تھے اور وہاں کمپن کے عہدے تک ترقی کی تھی اپنی ”آپ بیتی“ حصہ اول میں
تحریر فرماتے ہیں۔

اس پر صوبہ یوپی کے مولانا عبید اللہ باری مرحوم نے ہندوستان کو علمائے دیوبند
کی طرح دارالحرب قرار دے کر فتویٰ کہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ یہاں سے ہجرت
کر کے کسی دارالاسلام میں چلے جائیں اس پر پنجاب اور صوبہ سرحد کے مسلمانوں
میں ہجرت کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

(آپ بیتی حصہ اول ص ۲۰۹)

پھر کچھ آگے چل کر اس اجمالی کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

انگریزوں نے جن کو افغانستان کی مالی کمزوری اور ہندوستان کی تحریک ہجرت کی

بے ہوسامانی کا خوب علم تھا تحریک کو ناکام بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اسکے کارندوں نے ہندوستان میں لوگوں کو سبز باغ دکھائے اور کہا کہ وہ کابل پہنچتے ہی مالدار ہو جائیں گے۔ گورنمنٹ کے بعض ایجنٹوں نے انکے مذہبی جذبات بھڑکا کر انکو ہجرت کی ترغیب دی۔ اور اس طرح پراس تحریک کو افغانستان اور پنجابی اور سرحدی مسلمانوں کیلئے ایک رحمت کے بجائے ایک آفت بنادیا۔

(آپ بقی حصہ اول ص ۲۱۱)

اب اس مقام پر ایک صاحب سے کس طرح پوچھا جائے کہ آپ کیا فرمانا چاہتے ہیں انکی یہ تحریر بڑی معنی خیز معلوم ہوتی ہے۔ اور ویسے بھی اس مختصر عبارت اور حقیقی واقعات میں زبردست تضاد محسوس ہوتا ہے پھر بھی اسکی گہرائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ غضب یہ ہے کہ ہجرت کا فتویٰ مولوی عبدالباری اور علمائے دیوبند جاری فرمائیں اور ہندوستان کو دارالحرب یہ حضرات قرار دیں۔ اور گلی گلی یہ ترانا زبان زد ہو کہ دریا ئے انگ کے پار چلو قندھار چلو قندھار چلو اور حسب عادت کارستانی انگریزوں کے ایجنٹوں کی ثابت کیا جائے۔ اور یہ ہے کہ جناب ایک نے بھی اپنے چند ساتھیوں سمیت ہجرت کی تھی۔ یکس فرنگی ایجنٹ کا شکار ہوئے تھے؟

پھر یہ کہ اگر ایک صاحب کی بات تسلیم کر لی جائے تو (بلکہ ضرور تسلیم کر لینی چاہئے) کیوں کہ انہوں نے پچھتم خود وہ سبز باغ دیکھے تھے اور ترک وطن کیا تھا۔ ہجرت کا پروگنڈہ کر نیوالے اور مذہبی جذبات بھڑکانیوالے انگریزوں کے ایجنٹ تھے جنہوں نے ہجرت کی ترغیب دی تو فتویٰ دینے والے علمائے دیوبند اور اصرار کرتے ہوئے ہادیان دہند کو کیا کہا جائیگا جنہوں نے بھڑکانیوالا کام نہایت اعلیٰ یمانہ پر کیا تھا۔ بلکہ ہجرت سے روکنے والوں کو اسوقت انگریزوں کا ایجنٹ کہا جا رہا تھا اور بد میں بھیجنے والوں کو ایجنٹ کہا جا رہا ہے کاش یہ منطق ہمیں کوئی سمجھا سکتا۔

اور جناب ایک کی مراد یہ نہیں تو پھر کیا ہے "ہجرت کے فتویٰ پر سادہ لوح مسلمانوں نے اپنے گھر اور کھیت آدھے مول پر بیچ دئے اور نتیجہ دعا فیت کو سوچے بغیر افغانستان کی طرف روانہ ہو گئے" آپ بقی ص ۲۱۰

اب یہاں یہی کہا جاسکتا ہے کہ ۵۔ لوہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ نام، یہ جانتا اگر تو لٹا تا نہ گھر کو میں اور یہ سادہ لوحی بھی ابھی رہی۔ مسلمان اپنا گھر اور کھیت آدھے داموں نہ بیچتے تو کیا کرتے ایک طرف فتویٰ کا زور تھا دوسری طرف رہنمایانِ ملت کی شمشیر برہنہ تھی اور سیری طرف سازشی ہندوؤں یعنی برادرانِ وطن کی ترغیب و تحریص تھی اور چوتھی طرف سنگلاخ وادیوں کا راستہ کھلا تھا۔ آدھری چل پڑے مگر افسوس کہ وہ بھی بند ہو گیا اور یہ وقت کھلائے۔

بیچاری پردہ پوش عورتیں وہاں سخت مشکلات میں مبتلا ہوئیں بعض بد اخلاق کابلیوں نے ان پر سخن اندازی کی۔ بعض لوگوں نے کھانا خریدنے کیلئے اثاثہ البیت بھی فروخت کرنا شروع کر دیا۔ جیکے کابلیوں نے آدھے دام بھی نہ دئے۔

(آپ بقی ص ۲۱۳)

سیرت امیر ملت سے | اس باب سیرت امیر ملت کا تجزیہ یہ تجدیدی ہے کیونکہ یہ سیرت ایک عظیم بزرگ کی ہے جسکی عظمت سے اپنے تو اپنے پرانے بھی انکار نہیں کر سکتے۔ جنہوں نے اپنی طویل زندگی کا ایک ایک لمحہ خدمتِ دین و وطن میں صرف فرمایا۔ جوانی پوری حیات مبارکہ میں باطل کے سامنے سینہ سپر رہے جو بیک وقت الحافظ القاری المحدث تھا "سیرت امیر ملت" اس مرحلہ کی سیرت ہے جو خود ہر اسلامی تحریک میں نہ صرف پیش پیش تھا بلکہ اُسے پوری ایمانی جہالت سے قیادت کی تھی۔

خلافت کی تحریک میں اندازہ مدائنت ہندو لیڈر خصوصاً گاندھی مسلمانوں

کیسا تہ تعاون کرتے رہے تھے، لیکن جیسا کہ شدھی تحریک سامنے آنے سے ظاہر ہو گیا، درپردہ مسلمانوں کے نقصان پہنچانے کے لیے تھے زمانہ خلافت کے جوش و خروش سے کام لیتے کیلئے مسٹر گاندھی نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ انگریزی حکومت سے ناراضگی کے اظہار کیلئے مسلمان افغانستان کو ہجرت کر جائیں، مسلمان لیڈر اور علماء ہندوؤں کی اس چال کو نہ سمجھ سکے اور انہوں نے زور و شور سے ہجرت کی تبلیغ شروع کر دی حضرت قبلہ عالم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے علی الاعلان تحریک کی مخالفت فرمائی اور مسلمانوں کو ہجرت سے باہر اور بتا کر منع فرمایا (سیرت امیر ملت ص ۲۲)

اس معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ اور ان کے رفقاء کا رد علماء دین اور بزرگان دین و ملت مشائخ عظام اس ”تحریک ہجرت“ کے سخت مخالف تھے کیونکہ حق یہی تھا کہ ہجرت بہر صورت مسلمانوں کیلئے مفید نہیں۔

دربار عالیہ گولڑہ شریف دوران تحریک خلافت مشائخ اہلسنت نے نہایت واضح طریقہ سے ایسی تحریکوں سے اجتناب فرمایا تھا جس میں مشرکین کا اشتراک یا ان کی قیادت و سیادت ہو۔ اس سلسلہ دربار عالیہ گولڑہ شریف ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اور جسے تحریک خلافت کے زمانہ میں مشق ستم بنایا گیا۔ مگر خدا کے نور سے دیکھنے والی عظیم ہستی اپنے موقف اور اپنے نظریہ پر قائم رہی۔ اس سلسلہ میں اپنے نہایت دلیری سے فرمایا تھا، ”کہ میں گاندھی کی قیادت کو تسلیم نہیں کرتا اور جب ہجرت کا دور شروع ہوا تو آپ نے اس کی بھی مخالفت فرمائی اس سلسلہ میں ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے

حضرت قبلہ عالم قدس سرہ کے ایک ارادت مند مولوی صاحب نے ہزارہ سے لکھا کہ حضرت ہم تو اللہ کی راہ میں ہجرت کر رہے ہیں آپ پیری مریدی سے بچھا کر بیٹھے رہئے۔

یہ صاحب اگلے ہی ہفتہ ہی اشک مذمت بہاتے ہوئے واپس لوٹ آئے اور کہتے تھے، ”اگر کابل کی طرف قبیلہ ہوتا تو اداسگی نماز کیلئے بھی اس طرف رخ کرنے کو جی نہ چاہتا۔“

(مہر نیرباب ۵ ص ۲۹)

دی بات انگریزوں کے ایجنٹ ہونے کی تو علماء کے اس خاص طبقے اور ان کے متبعین کا یہ دھیرہ رہا ہے بلکہ اب بھی ہے کہ ہر اس فرد کو جو ان کی ہاں میں ہاں نہ ملائے اُسے ایسے ہی دلوں کا خطاب سے نوازتے ہیں بالکل یہی خطاب قائد اعظم اور مسلم لیگ کو بھی عطا ہوئے تھے بلکہ انہوں نے اس عظیم خطاب سے اپنے بزرگوں کو بھی نہیں بچتا ہے جناب شورش ان حضرات کے جتنے ہی زیادہ ارادت مند تھے بعد میں ان کے عطا کردہ خطابات و نوازشات سے اتنے ہی زیادہ دکھی ہوئے۔ چنانچہ اپنا ذاتی بیان فرمائے ہوئے لکھتے ہیں

میرا ذاتی تجربہ ان لوگوں کے بارے میں یہ ہے کہ ان کا اسلام سے محض کاروباری واسطہ ہے

ان کے متعلق میرا یقین ہے کہ غایت درجہ کے خود فروش لوگ ہیں

(چٹان ۱۹ جنوری ۱۳۲۷ء ص ۱۲)

علامہ مشرقی کا ہولناک انکشاف یہاں ہم خاکسار رہنما علامہ مشرقی کے عقائد و نظریات اور ان کے مذہبی و سیاسی حالات سے

قطع نظر ”تحریک ہجرت“ کے باب میں ان کا عندیہ پیش کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں

اپنا اوسبھا کر نیا لوں اور باقی تمام دنیا کو الودینا نواے ملاؤں کی ہلاکت آمیز تعلیم کے اثر کو دور کرنے کیلئے میں نے ۱۹۲۰ء میں جبکہ یہ لوگ کانگریس کی ملی جھگڑ سے

قوم کا پچھتر لاکھ روپیہ بے دکا دھم کر گئے۔ اور پچیس ہزار مسلمانوں کو ہجرت ڈھکیل کر ہندوستان میں گاؤں لکھ لگائے اپنی موپھیں پونچھ رہے تھے

راخبار المصباح لاہور ۲۸ جولائی ۱۹۲۹ء مسلمانوں کا روشن مستقبل (۲۹)

سیاسی میدان میں مسلمانوں کی مکمل شکست

بہر صورت ایک آیا کہ مسلمانوں کا جوش و جذبہ اور ان کی تمام قربانیاں گاندھی جی کے ہاتھوں انجام کو پہنچ گئیں اور سیاسی میدان میں مسلمانوں کو زبردست شکست ہوئی اور یہ سب گاندھی جیسے کٹر ہندو پر بھروسہ اور اعتماد کی وجہ سے ہوا جیسا کہ جناب ڈاکٹر قمری لکھتے ہیں

خلافت کے حق میں تحریک شروع ہوئی (رولٹ ایکٹ ۱۹۱۹ء) کے منظوری کے بعد تحریک ترک موالات کا پراشتعال واقعہ پیش آیا سنہ ۱۹۲۰ء تک برصغیر پاک و ہند اس کی پلیٹ میں آچکا تھا خلافتی لیڈروں کی گرفتاریوں نے "مشترک قیادت" کے نام پر تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کی باگ ڈور کانگریس کے ہاتھ میں دیدی تھی جب مہاتما گاندھی نے یک لخت تحریک کے خاتمے کا اعلان کیا تو سیاسی میدان میں مسلمانوں کی شکست مکمل ہو چکی تھی۔

پاکستان کی نظریاتی بنیادیں ڈاکٹر وحید قریشی

باضابطہ خاتمہ | ان جملہ تحریکات کے متعلق جناب رضی حیدر لکھتے ہیں کہ

دسمبر ۱۹۲۲ء کو بیکانہ کے مقام پر گاندھی جی کی صدارت میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس میں بڑے حیرت انگیز فیصلے کئے گئے ایک قرار داد کے ذریعہ ترک موالات اور مقاطعہ کو باضابطہ ملتوی کر دیا گیا (قائد اعظم کے بہتر سال ۱۹۲۹ء)

انجام کار حج یا دعائیں جتنی دعائیں صوف درباں موگیں۔

مولانا علی ندوی کا ارشاد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جو بات اپنی کتاب

"پرانی چراغ" میں تحریر فرمائی ہے۔ اور جس پر غم کا اظہار فرمایا ہے۔ اُسکے سچ ہونے میں شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ مگر یہی بات جب بہت پہلے کہی گئی تھی۔ اور ان تحریکات کے مواقع و نتائج پر نظر رکھنے کیلئے علمائے حق نے فرمایا تھا محض انگریزوں کا ایجنٹ قرار دیا گیا تھا۔ علی ندوی فرماتے ہیں۔

بد قسمتی کی بات تھی کہ انہوں نے (محمد علی جوہر مرحوم) ایک ایسے مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا اور اسکو اپنی سحر انگیز شخصیت کی توانائیوں اور قائدانہ صلاحیتوں کا محور بنایا تھا جس کی زمام کار انکے ہاتھ میں نہیں بلکہ ملک کے باہر سات سمندر پار ایک ایسی جماعت و فرد کے ہاتھ میں تھی (مصطفیٰ کمال) جو انکے مشوروں کا تابع اور انکی ہدایتوں کا پابند نہ تھا بلکہ اپنے مصالح اور مغربی طاقتوں کے پیچھے امرو کا غلام تھا۔ یعنی مسئلہ خلافت جسکو کمال اتاترک نے اتحادیوں کے اشارہ اور خاص طور سے برطانیہ کے مشورہ اور ہدایت پر بیک جنبش لب یا گردش قلم ختم کر دیا۔ اور سارا عالم اسلام خاص طور پر ہندوستان کا مجروح ستم رسیدہ مسلمان دیکھتا دکھتا رگدیا (پرانے چپراغ مٹا)

ہندو مسلم اتحاد کے خوفناک بچے

ترک ذبیحہ گاوہ شدھی، شنگھٹن حقائق و شواہد کی روشنی میں ہم پوسے و ثوق کیساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان تحریکات و تحریک

خلافت، تحریک ترک موالات، ہندو مسلم اتحاد کی وجہ سے اور ان میں ہندوؤں کی نہ صرف شرکت و شمولیت بلکہ قیادت و سیادت کی وجہ سے برصغیر کے مسلمانوں کو انتہائی اندوہناک مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور غم کی یہیں طویل سے طویل تر موتی چلی گئیں۔

ان عنوانات پر امام احمد رضا اور انکے رفقاء کرام (رحمہم اللہ تعالیٰ) کے نظریات کا ہم بعد میں ذکر کریں گے۔ پہلے آپ مؤرخین کی رائے کے ملاحظہ فرمائیں۔

جب مسلمان لیڈر خاموش تھے۔ ہندو لیڈر شدھی کے نام سے مسلمانوں کو مرتد اور شنگھٹن کے نام سے مسلمانوں کو قتل و قتل کر رہے تھے۔ تو یہ کانگریسی لیڈر مہاسیماںیوں کے پشت پناہ تھے۔ انھوں نے ہر مہاسیماںی کے خلاف نہ احتجاج کیا نہ جدوجہد کی پھر جب ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے

توسلمان لیڈر عامۃ المسلمین کو امن پسندی کی تلقین کیلئے میدان میں اتر پڑے اور گاندھی جی نے کہا تو یہ کہ ”ہندو بزدل ہیں اور مسلمان دنگی“ انھوں نے اور انکے ساتھیوں نے شردھانند کے خلاف ایک جھوٹا نہ کہا۔ مالوی جی کی امن سوزی اور اشتعال انگیزی پر چپ سادھی موئے کیا کر، جبکہ اور دوسرے آتش زبیر یا ہندو لیڈروں کے مقابلے میں کبھی نہ آئے۔ بلکہ اگر کسی مسلمان نے انکے خلاف لب کشائی کی تو ”بچھر گئے، بگڑ گئے۔ امر تسر کے ایک جلسہ میں مولانا ظفر علی خاں نے پنڈت مدن موہن مالوی کی تفرقہ انگیزی اور فتنہ پروری کے خلاف کچھ کہ دیا تو گاندھی جی جو صدر جلسہ تھے بگڑ گئے اور انہوں نے کہا۔ آپ نے مالوی جی پر نکتہ چینی کر کے میرے سینے پر گھونٹ مار دیا۔ سوامی شردھانند کا حادثہ قتل حجب واقع ہوا تو انکی دوش کینہ خلاف کسی نے ایک حرف بھی نہ کہا۔ البتہ گاندھی جی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

(قائد اعظم محمد علی جناح اور انکا عہدہ رئیس جمہوری)

غم و اندوہ کی طویل داستان ”متحدہ قومیت“ کے نتیجے میں مسلمانوں کی مسلسل پامالی، اور ہندوؤں کی مسلسل جاہلیت مسلمان رہنماؤں کا مکمل سکوت ہندو لیڈروں کی خول آشامی کی داستان الم بڑی طویل ہے جو ان اوراق میں نہیں سما سکتی۔ جناب رئیس احمد تحریر فرماتے ہیں

مسلم قیادت اب بھی پر امید تھی۔ وہ ہندوستان کو میدان جنگ نہیں بنانا چاہتی تھی، اخوت اور اعتماد باہمی کی جنت بنانا چاہتی تھی وہ اشتعال کی رو میں بھی نہیں بلکہ اخفاق کی آگ پر پانی بکڑ گرتی اور اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی رہی گاندھی جی کی طوط سے، کانگریس کے ہندو لیڈروں کی طوط سے شددھی کی سوامی کو۔ اور شنگھٹن کی مالوی جی کو پوری آزادی حاصل تھی۔ کیا مجال ہے جو موتی لال اور جواہر لال جیسے ”لامذہب“ ننگ نے ان غلط کام ہندوؤں کو ٹوکا ہوتا البتہ مسلمانوں نے یہ کیا کہ مجلس خلافت نے ڈاکٹر کچلو کر خلافت

کمیٹی سے برطرف کر دیا کیونکہ وہ تنظیم کے علمبردار تھے اور محمد علی نے خواجہ حسن نظامی کے خلاف میدان جنگ قائم کر دیا کیونکہ وہ تبلیغ کے سپہ سالار تھے مسلم لیگ میں اگر کسی نے شددھی اور شنگھٹن کے خلاف لب کشائی کی تو مسٹر جناح شمشیر براں بن گئے۔ علی برادران اور جناح کی یہ دوش اس لئے تھی کہ یہ اب تک ہندو مسلم اتحاد کے خواہاں اور جو یا تھے

(قائد اعظم اور انکا عہدہ ۱۵۸)

شددھی کی تحریک

ہم بلاشبہ کہہ سکتے ہیں مسلمان قوم ایک جاندار قوم ہے ۱۸۵۷ء ہی سے نہیں بلکہ اس سے بھی بہت پہلے سے ایک تسلسل کیساتھ کچلی اور پامالی کی جارہی تھی مگر اس کی جی داری اور جذبہ ایمانی ناقابل تسخیر تھی تحریک ہجرت وغیرہ کے عذاب ناصواب سے ابھی سینھنے بھی نہ پائے تھے کہ گاندھی جی ان سے الگ ہو گئے اور ابھی حیرت بھی دور نہیں ہوئی تھی کہ تحریک شددھی جاری ہو گئی۔

اس کے لیڈر سوامی شردھانند۔ (جنھیں دہلی کی جامع مسجد میں بھگا کر وعظ کرایا جاتا تھا) لالہ لاجپت رائے۔ اور ڈاکٹر موئے تھے۔ سیدھے سادے لفظوں اس کا مقصد یہ تھا کہ غیر ہندو کوہ اس تدبیر سے جو ممکن ہندو بنالیا جائے اور انھیں ہندو دھرم میں شامل کر لیا جائے۔ چنانچہ روزنامہ پرتاب لاہور نے اس موضوع پر ایک مضمون شائع کیا جو ہم ”تحریک پاکستان ۱۹۲۱ء سے نقل کرتے ہیں جس سے اس تحریک کی نوعیت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اس ملک میں حکومت عددی اکثریت پر موقوف ہے اس لئے شددھی کی تحریک ہندوؤں کیلئے موت و حیات کا مسئلہ ہے اس ملک میں مسلمان ایک حقیر اقلیت سے سات کروڑ کی تعداد تک پہنچ چکے ہیں۔ عیسائی چالیس لاکھ ہیں اور ملک کے بائیس کروڑ ہندو ان کی وجہ سے بے دست و پا ہو کر رہ گئے ہیں اگر انکی تعداد میں ہی بڑھتی رہی تو نہ جانے کیا حشر ہوگا۔

شددھی کی تحریک بنیادی طور پر مذہبی تحریک ہے۔ مگر اس کے دوسرے مضمرات

نے عام ہندوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے مذہب میں قبول کر لیں
(تحریک پاکستان ۱۹۴۰-۱۹۴۷ء پروفیسر محمد خلیل اللہ)

یہ ایک نہایت خوفناک جبار تنظیم تھی اس کی تفصیل بھی جناب
پروفیسر محمد خلیل اللہ صاحب سے سنئے۔

شنگھن

شدھی کیساتھ ساتھ ایک اور تحریک شنگھن شروع ہوئی جس کے بانی ڈاکٹر مہنجے
بتلا جاتے ہیں۔ اس تحریک کا مقصد ہندو معاشرے کو ایک مربوط، منظم اور فعال
معاشرے میں تبدیل کرنا تھا۔ ڈاکٹر مہنجے نے اسکی اہمیت اور باہمیت پر روشنی ڈالتے
ہوئے کہا تھا۔

”جس طرح انگلستان انگریزوں کا ہے، فرانس فرانسیسیوں کا اور جرمنی جرمنوں
کا اسی طرح ہندوستان ہندوں کا ہے اگر ہندو منظم ہو جائیں تو وہ انگریزوں
اور ان کے چھوٹے مسلمانوں کو مغلوب کر سکتے ہیں ہندوں کو اپنی دنیا آپ پیدا
کرنی ہے جو شدھی اور شنگھن کے سہارے پروان چڑھے گی۔“

ان تحریکوں کے ایک اور سرگرم کارکن ہر دیاں نے تو ان عزائم کو بھی واضح کر دیا
”شنگھن کی تحریک کا مقصد ہندوستان میں ایک مضبوط متحد اور بیدار سیاسی
جماعت کا قیام ہے جو ایک آزاد ہندو ملک کے قیام کیلئے مسلسل کوشش کریگی
ہندو قومی مملکت کی بنیاد ہندو اور اہل ہند پر ہوگی۔ مثلاً سنسکرت زبان، ہندی
زبان، ہندو تاریخ، ہندو تہوار، ہندو سوراؤں کا احترام۔ ہندوں کے مقدس
مقامات کا احترام اور ہندو مذہب سے محبت وغیرہ

ہمارے درمیان ایسے لوگ بھی ہیں جو بلاوجہ آزادی ہند کی تحریک میں نیم عرب
اور نیم ایرانی مسلمانوں کو بھی شامل کرنا چاہتے ہیں انھیں خبر نہیں کہ قومی مملکت
اپنی قدیم قومی لوازمات اور اداروں کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ اور یہی
عناصر مملکت کے بامقصدوں کو متحد کر سکتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمان تو
محض ایک غیر متعلق اور غیر ضروری عنصر ہیں۔ انکا مستقبل بس یہی ہے

کہ وہ شدھی تحریک کے ذریعہ ہندو مذہب میں شامل ہو جائیں۔
(تحریک پاکستان ۱۹۴۰-۱۹۴۷ء)

یہ تحریک ایک نیم فوجی تحریک تھی ہندوں کو باقاعدہ جنگ و جدال کی تربیت
دی جاتی تھی۔ ملک کے گوشے گوشے اکھاڑے قائم کئے گئے تھے کشتی اور لٹھ بازی
اور شورش برپا کرنے میں انھیں ماہر کیا جاتا تھا۔ ان دونوں تحریکوں نے مسلمانوں کو جھوٹ
کر رکھ دیا۔

حتیٰ کہ اس وقت قائد اعظم اتحاد کے قائل ہونے کے باوجود یہ فرمانے پر مجبور ہو گئے
جیسا کہ جناب رفی حیدر لکھتے ہیں

ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے
کہا کہ اس مقصد کیلئے ضروری ہے کہ طرفین کے مابین دوستانہ اور پر خلوص
جذبات کو فروغ دیا جائے۔ بد قسمتی سے حال ہی میں شدھی اور شنگھن
کی تحریکوں کا د کشتی اور مسجدوں کے قریب بلجے بجانے کے سوال پر جو
فسادات ہوئے ہیں قابل مذمت ہیں ہر چند مسائل منقول نوعیت کے ہیں
لیکن ہم چاہتے ہیں کہ طرفین ان فسادات کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے
جیو اور جینے دو کئی پالیسی پر عمل کریں
(قائد اعظم کے بہتر سال ۱۹۴۷ء)

”انھیں حالات سے متاثر ہو کر ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ میں منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے
سالانہ اجلاس کی ہدایت کرتے ہوئے، جناب سر عبدالرحیم نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا

ہندو مباسجہ شدھی شنگھن کے علاوہ لالہ لاجپت رائے اور سوامی شرودھانند
ایسے سیاستدان بھی مسلمانوں پر حملہ کرنے سے باز نہیں آتے جس طرح اسپین داؤں
نے مورس (مسلمانوں) کو اسپین سے نکال ڈالا اسی طرح مسلمانوں کو ہندوستان
سے نکال دے چند ہندو لیڈروں نے بھی کھلم کھلا طور سے اعلان کر دیا ہے لیکن
میرے ہندو دوستوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمان ان کے منہ سے کہیں

مولانا محمد علی جناح اور ان کا عہد ۱۵۹

محمد علی جوہر کی سوچ

بالآخر وہ دن بھی آگئے جب ہندو ذہنیت کا عفریت کھل کر سامنے آگیا اور اسلام کی محبت سے لبریز دل پاش پاش ہو گئے اور وہ لوگ جو ان تحریکات کے علمبردار تھے جنکی جرأت و استقلال کے سامنے پورے ہند کے ہندو "تودہ ریگ" سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے جناب سید ابوالحسن علی ندوی مولانا محمد علی جوہر کے تذکرہ میں لکھتے ہیں

لیکن افسوس کہ جب ۱۹۲۳ء میں جب وہ آخری بار جیل سے باہر آئے تو انگریزی حکومت کی جسکی نمائندگی اسوقت ایک یہودی انسل وائسر لارڈ ریڈنگ کر رہا تھا سازش کا میاب ہو چکی تھی۔ ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہو چکا تھا شادی شنگٹھن کی تحریک آندھی کی طرح چل رہی تھی۔ بڑے بڑے شہروں میں فرقہ وارانہ فسادات و بیکس طرح پھوٹ پڑے تھے۔ مولانا محمد علی نے اپنی اسی سادگی اور مردانگی سے ان کی مذمت کی جو ایک مسلمان کا شیوہ اور ایک بہادر سپاہی کا مزاج ہے۔

لیکن ان کے زخمی دل کو اس سے بڑی چوٹ لگی کہ تحریک آزادی کے ہندو بھاولوں نے لگانڈھی جی کو مٹتی کر کے اس صاف دماغ اور کھلے دل سے ان فسادات کی مذمت اور اپنے فرقہ کے اُس رجحان پر تنقید نہیں کی اور وہ اسکے خلاف اس طرح صاف آرائیں ہوئے جیسی وہ توقع رکھتے تھے۔

اسوقت مولانا محمد علی نے اس طرح سوچنا شروع کیا کہ شاید انکی قسمت انکے ہم خیال اور ہم مذہب لوگوں ہی سے وابستہ ہے اور رفتہ رفتہ انڈین نیشنل کانگرس سے مایوس ہوتے چلے گئے۔ اور انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا میلان مسلمانوں کو بنالیا (پرانے چراغ ۱۵۵)

یہ تھے مولانا محمد علی جوہر مرحوم جنکی ہر ادا جذب و محبت سے لبریز تھی۔

انسان طبعاً کچھ لوگوں کو پسند اور کچھ لوگوں کو ناپسند کرتا ہے۔ اور یہ پسندی کسی فلسفہ کے تابع نہیں ہوتی زمانہ طالب علمی ہی سے محمد علی جوہر ہم سب ساتھیوں کو پسند کرتے۔ اُس وقت بچہ بچہ زبان پر یہ شعر ہوتا تھا۔

بویں اماں محمد علی کی
کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ

سیاست رانقلاب چہرہ کر دی
دگر نہ عاشق مستانہ یودی

رسیدی از رخ اغیار تار یار
عجب مستے عجب دیوانہ یودی

اور یہ تعجب ہے کہ اسوقت جب ہم لوگوں کو باشعور نہیں کہا جاسکتا تھا جوہر جتنا ہی پسند تھے ابوالکلام آزاد اُن سے ہی ناپسند کئے جاتے تھے غور و خوض کے بعد اب یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مولانا جوہر جتنے خلص تھے ابوالکلام آزاد اُن سے ہی مفاد پرست تھے واللہ اعلم تاریخ شاہد ہے کہ علی برادران (مولانا شوکت علی مولانا محمد علی)

علی برادران کی ویسی

اپنے تمام تر اخلاص کے باوجود ہندوؤں کیساتھ نہ رہ سکے اسلام کی کشش اور مسلمانوں کی محبت انہیں ویسی اپنوں میں لے آئی۔ اس باب میں محترم پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب نے اپنی کتاب "تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم" میں تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے خصوصاً انہوں نے اس موقع پر حضرت شاہ علی حین اشرفی کے خلیفہ طریقت صدر الافاضل حضرت مولانا نعیم الدین صاحب علیہ الرحمہ کا ذکر فرمایا ہے کہ ۱۹۲۰ء کے فوراً بعد ہی صدر الافاضل نے مولانا جوہر سے بات چیت شروع کر دی تھی۔ اس سلسلہ میں حضرت صدر الافاضل دہلی بھی مولانا کے پاس گئے تھے اور انھیں تمام شرعی اور سیاسی صورت حال سے آگاہ کیا تھا اور مولانا نے ہندوؤں سے الگ ہونیکا وعدہ بھی فرمایا جتنا

۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے لندن جانے سے قبل مولانا محمد علی جوہر صدر الافاضل سے ملنے آئے صدر الافاضل نے پھر ہندو مسلم اتحاد کے نتائج و عواقب کی طرف انکو متوجہ کیا۔ اس پر انہوں نے فرمایا "اگر زندہ رہا تو اس کی تلافی کی کوشش کروں گا"

مولانا شوکت علی خود مراد آباد جا کر صدر الافاضل کے دولت کدے پر حاضر ہوئے اور ان کے سامنے ہندو مسلم اتحاد کی حمایت و تائید سے دست کش ہوئے (تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم ص ۵۲)

علمائے اہلسنت کا کردار | حتیٰ یہ ہے کہ اس پر آشوب دور میں علمائے اہلسنت سیاسی جوڑ توڑ سے تقریباً الگ ہی رہے تحریکیں تھیں اور بگولوں کی طرح پوری قوم کی آنکھوں میں مٹی ڈالتی ہوئی گزر جاتی تھیں۔ شعلے لپکتے تھے اور گاؤں کے گاؤں خاکستر ہو جاتے تھے۔ تلواریں چمکتی تھیں اور چپہ چپہ لو میں ڈوب جاتا تھا۔ علمائے حق علماء اہلسنت آواز بلند کرتے جنہیں بے حقیقت قرار دیا جاتا۔

شدھی، شنگٹھن، ترک و غیرہ گاؤں کی تحریکیں جاری تھیں مسلمان شنگٹھن کے کاشکار ہو رہے تھے۔ اور رہنمایاں قوم صبر و ثبات کی تلقین فرما رہے تھے۔ عین اسوقت علمائے اہلسنت نے جو کارنامے انجام دیے آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں یہاں میں ”تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم“ سے چند اقتباس نقل کرتا ہوں جو حالات و واقعات کی وضاحت کیلئے کافی ہیں۔ محترم پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں

تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کے بعد تحریک شدھی نے شدت اختیار کی جس میں راجہ سے لیکر پر جاتک سب شریک تھے ۱۹۲۵ء میں آریہ سماج کے باقی دیانند کی صدمہ سالہ تقریب کے موقع پر ایک جلسہ میں ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے ہندو لیڈر جمع ہوئے اور وہاں مسلمانوں کو مرتد و مگراہ کر نیکی ایک خفیہ سازش تیار کی گئی۔ ارتداد کی اس تحریک نے مسلمانان ہند میں ایک اضطراب پیدا کر دیا علمائے حق نے اس کی پوری پوری مزا حمت فرمائی جن میں یہ حضرات قابل ذکر ہیں۔ حضرت مولانا شاہ حامد رضا خان صاحب۔ حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب۔ حضرت مولانا مفتی مصطفیٰ رضا خان صاحب۔ مولانا غلام قطب الدین اشرفی برہمچاری

مولانا احمد مختار صدیقی صاحب میرٹھی۔ مولانا ابوالبرکات سید احمد صاحب غیرہ غیرہ۔ ۱۹۲۳ء میں تحریک شدھی چلی جس میں سوامی شرودھانند، پنڈت کالی چسرن، پنڈت رام چندرا، دھرم بھکشو لکھوی وغیرہ نے بھرپور حصہ لیا۔ اسکے مقابلہ کیلئے یریلی سے در جماعت رضائے مصطفیٰ، میدان عمل میں آئی۔ اسکے بعد جماعت اشرفیہ حلقہ اشاعت الحق اور انجمن خدام الصوفیہ صدر الافاضل اور تاج العلماء کے شیخ طریقت حضرت شاہ علی حسین اشرفی علیہ الرحمہ نے باوجود کبرئی تحریک شدھی کا پوری قوت سے مقابلہ کیا۔ براہ راست تبلیغ کے علاوہ مندرجہ ذیل طریقے بھی اختیار کئے گئے۔

• معالج حیوانات کے بھیس بدل کر۔ وید حکیم کا بھیس بدل کر۔ گانے والے طالبہ کا بھیس بدل کر۔ سادھوؤں کا بھیس بدل کر۔

مولانا سید قطب الدین برہمچاری اور ان کے شاگرد غلام قادر اشرفی نے بھیس بدل کر نہ صرف مرتدین کو مشرف باسلام کیا بلکہ بہت سے ہندوؤں کو حلقہ بگوش اسلام کیا مجموعہ طور پر ساڑھے چار لاکھ مرتد مسلمان ہوئے اور ڈیڑھ لاکھ ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔ بھیس بدل کر جو اشاعت اسلام کی کوشش کی اس سے پچاس ہزار ہندو مسلمان ہوئے۔

مسلمان ہونے پر جو سبب جاری کی جاتی تھی اسکے چار حصے ہوتے تھے۔ ایک اسلام قبول کرینے کو دیا جاتا۔ دوسرا صدر دفتر بھیجا جاتا تیسرا ریکارڈ میں محفوظ کیا جاتا۔ اور چوتھے پرنومسلم کی چوٹی کاٹ کر لگائی جاتی

(تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم ص ۲۶ تا ۲۸)

جاں نثاران اسلام | اور ہر فرعون نے راموٹی یہ ضرب المثل ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ناممکن ہے اندھیروں کی کوکھ سے روشنی پھوٹی ہے۔ رات کی تاریکیوں کے دامن سے لیٹی ہوئی صبح نمودار ہوتی ہے۔ ہندوستان کی کوکھ نے جہاں شرودھانند کو پیدا کیا۔ راجپال کو پیدا کیا۔ بھولانا تھا، پالائل تھو رام کو

مسئلہ فیبحہ گاؤ

اس باب کو میں جناب ”پروفیسر محمد خلیل اللہ“ صاحب کی کتاب ”تحریک پاکستان کے اس اقتباس سے شروع کرتا ہوں کہ

بیمہ گاہ کی مخالفت مسلمانوں کے خلاف ایک اور موثر مہم تھی۔ اس سلسلے میں ایک بات قابل ذکر ہے۔ جہاں تک گائے کا گوشت کھانے کا تعلق ہے مسلمان اور انگریز برابر ہیں۔ چنانچہ انگریز چھاؤنیوں میں برابر گائے کا گوشت کھاتی تھی مگر برطانوی حکومت کے دور کی ساری تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا۔ جہاں گائے پرست ہندوؤں نے انگریزوں کے خلاف اس ضمن میں کوئی مظاہرہ اور احتجاج کیا ہو۔ مگر اسی سوال پر مسلمانوں کے خلاف بالآخر تمام قسود برپا کئے گئے

(تحریک پاکستان صفحہ ۱۳)

تحریک ترک ذبیحہ گاؤں بھی منجملہ دیگر دباؤں کے ایک دباہتی اور اسے شعائر اسلام
مٹانے کی نہایت خوفناک سازش کہا جائے تو کچھ غلط بات نہیں ہوگی۔ اسوقت اس مسئلہ کو نہایت
سادگی سے پیش کیا جاتا تھا۔ کہ کیا گائے کی قربانی ہی ضروری ہے کیا اسکے بجائے دوسرے
جانور مثلاً اونٹ، دنبہ، بکری، بھینس وغیرہ کی قربانی نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ مسئلہ کے لحاظ سے
گائے کی ہی قربانی ضروری نہیں دوسرے جانور بھی کئے جاسکتے ہیں۔ جواب میں یہ کہا
جاتا کہ ”پھر آپ اپنے ہندو بھائیوں کا دل نہ دکھائیں“ گائے کے بجائے کوئی اور جانور
کر لیا کریں۔

حیرت تو یہ ہے کہ اسکے عواقب و انجام شاذ و نادر ہی لوگ سمجھ پائے اور اکثریت اسی ڈگر پر چل نکلی کہ واقعی کیا ضروری ہے کہ گائے کی ہی قربانی کی جائے جتنا بچہ بہت بڑے بڑے تداور لوگوں نے در ترک و بیچ گاؤں کے متعلق بیانات داغ دیے۔ اور جب الام احمد رضا علیہ الرحمہ اور انکے رفقاء نے صحیح صورت حال اور صورت مسئلہ کی وضاحت کی تو انھیں متعصب و رقتہ انگیز کہا گیا۔

اس ضمن میں ہم پہلے شاہ افغانستان امان اللہ خاں کا بیان پیش کرتے ہیں۔ جنکے اہلداد اور جنکے ملک کے

پیدا کیا وہیں اُسی سرزمین نے قاضی عبدالرشید، غازی علم الدین، عبداللہ اور امیر احمد، محمد صدیق غازی عبدالقیوم کو بھی پیدا کیا۔

تحریک شہمی کی ناکامی اور سنگٹھن کی شکست کے بعد ہندوؤں نے اسلام اور رسول اکرم کی شان میں علی الاعلان گستاخیاں شروع کر دیں اور گستاخیوں سے لبریز کتابوں، کتابچوں رسالوں اور اشتہاروں کا ایک سیلاب منڈ آیا اور پھر غیرت مند مسلمانوں نے اس کا بھرپور محاسبہ کیا۔

چنانچہ شہر دھانڈ کو قاضی عبدالرشید نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ راجا کو غازی علم الدین نے جہنم رسید کر دیا۔ بھولانا تھکس کو عبداللہ اور امیر احمد نے فنا کر دیا۔ بدلال کو محمد صدیق نے قتل کر دیا اور کراچی کے ننھورام کو غازی عبدالقیوم نے دوزخ میں بھیج دیا۔ خدا رحمت کند ایں عاشق ایاک طینت را

کمر دار کی ایک اور جھلک

انھیں ایم میں حبیب تاریکیوں کی پوش تھی اور باغرت
مسلمان مشرکین کے ہر حملہ اور ہر یلغار کیلئے سینہ
سپر تھے اور منستہ، مسکراتے تختہ دار پر چڑھ جاتے کچھ علماء کچھ مفتی اور رہنمایان دین و
ملت ایسے بھی تھے جو سہدوں کی محبت میں ان شہیدوں کو جنت کی بو سے بھی محروم
فرما رہے تھے۔ چنانچہ

جمعیۃ العلماء ہند کے صدر مفتی محمد کتابت اللہ نے شرعاً ہند کے قاتل غازی
عبدالرشید کیلئے فتویٰ دیا کہ وہ جنت سے محروم ہے۔ انہوں نے فرمایا
کہ فرماہد کہ قاتل جنت کی بوجہ نہ سونگھے گا ص ۲۳۵.....
اسی طرح جب راجپال نے اپنی کتاب رنگیدار رسول شائع کی اور مسلمانوں
کے احتجاج پر اسکے خلاف مقدمہ چلا اور عدالت عالیہ پنجاب نے اس کی
بری کر دیا تو پھر جب پنجاب کے ایک نوجوان غازی علم الدین نے
اسکو قتل کیا تو ابھی مقدمہ زیر ماعت تھا لیکن قوم پرست پریس نے علم الدین
کو مرتکب جرم قرار دیا اور اس فعل کو برتر دانہ قرار دیا

باجبوت حکمرانوں سے بھارت کی وسیع سرزمین تھراتی تھی۔ پروفیسر محمد مسعود صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

شاہ افغانستان امان اللہ خاں سیاحت یورپ کے دوران ہندوستان سے گزے تو بمبئی میں جمعہ کی نماز کی امامت فرمائی اور خطبہ جمعہ میں فرمایا۔
سنائیت درجہ شرم کی بات ہے کہ ہندوستان کے مسلمان گائے کے سوال پر ہندوؤں کے جذبات کی عزت نہیں کر سکتے۔

(تحریک آزادی ہند ۲۲)

اسی طرح جناب حکیم اجمل صاحب۔ جناب مولانا عبدالباری صاحب۔ جناب مولانا ابوالکلام آزاد صاحب۔ جناب خواجہ حسن نظامی صاحب۔ اور دیگر کانگریس کے مفتی صاحبان نے یہ فتویٰ دیا کہ گائے کی قربانی ضروری نہیں۔ ہندوؤں کی دلجوئی کیلئے گائے کی قربانی بند کر دی جائے۔ اور جب یہ سب لوگ پولیس تو جمعیت العلماء ہند کیسے خاموش رہ سکتی ہے۔

”ہندو مسلم اتحاد کے نام پر جمعیت العلماء ہند اپنے اجلاس ۱۹۲۱ء میں یہ قرارداد منظور کرتی ہے ”مسئلہ گاؤں کشی کے بارے میں ہندوؤں کی دلجوئی کیلئے مسلمان گائے کے بجائے بھیڑ بکری کی قربانی دیا کریں۔“

(تجلیات عثمانی)

انھیں ایام میں ہندوینا اور ہندوؤں کے یہ سازشی لیڈر مسلسل جال پھیلا رہے تھے اور مسلمانوں پر گرفت مضبوط سے مضبوط تر کرتے چلے جا رہے تھے۔

دیکھنا یہ ہے کہ جب مسلمان علماء مسلمان مفتی مسلمان لیڈر برادران وطن کا نظریہ

گئے تھے جہاں تک جانی کا تصور بھی ناممکن نظر آتا ہے اس وقت ہندو رہنما کیا سوچ رہے تھے بلکہ علی الاعلان کیا کہہ رہے تھے۔ کانگریس کے جنرل سکریٹری اچاریہ کرپلائی کہتے ہیں

گاندھی جی نے کانگریس کو بتایا کہ ہمارا کام صرف یہ نہیں کہ سیاسی باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھ سے چھین کر اہل ملک کے ہاتھ میں دیدیں بلکہ سب سے ضروری

کہ ہم تمام جدوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفہ حیات پر رکھیں جس کے دائرے میں ہماری معاشرت، اخلاق اور روحانیت سب داخل ہو۔
یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ کانگریس کی ہر اسکیم گاندھی جی کے فلسفہ کے ماتحت چلائی جائے گی یہ ہرگز ممکن نہیں کہ آپ کسی اسکیم اور کسی اور فلسفہ زندگی کے اصول پر چلا سکیں۔

کانگریسی اسکیموں کا قلم کسی اور فلسفہ پر نہیں لگایا جاسکتا۔ یہ فلسفہ زندگی دینا کے کسی اور فلسفہ زندگی کے ماتحت نہیں بنایا جاسکتا۔

گاندھی کا فلسفہ زندگی ایک ایسا مکمل فلسفہ ہے جس سے اجتماعاً قوم بھی صحیح رہبری حاصل کر سکتی ہے اور فرداً فرداً اشخاص بھی اس سے سیدھا راستہ پاسکتے ہیں۔

(تحریک آزادی ہند ۱۹۳۹ء بحوالہ اخبار مدینہ میٹرو، ۱ اگست ۱۹۳۹ء)

اسی طرح مسٹر کشور آپٹے کہتے ہیں

”مسلمانوں کو اگر ہندوستان میں رہنا ہے تو انھیں ہندو بن کر رہنا ہے اور ہندو تہذیب و تمدن کو اپنا نا ہو گا۔“

مسٹر گوالگر کہتے ہیں

”ہندوستان میں رہنے والے غیر ہندو افسردہ کو ہندو تہذیب اور زبان کو اپنا لینا چاہئے۔“

(ماخوذ تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم)

سیدنا امام احمد رضا علیہ الرحمہ و مسئلہ ذبیحہ گاؤ

علامہ اقبال کی رائے اور انکی وصیت | اس باب کو ہم "اوراق گم گشتہ" مولفہ "رحیم بخش شاہین ایم اے" کے ایک اقتباس سے شروع کرتے ہیں۔ زیر نظر کتاب "اوراق گم گشتہ" حضرت علامہ اقبال کی غیر مندرجہ تحریروں پر مشتمل ہے حضرت علامہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے متعلق لکھتے ہیں

ہندوستان کے دورِ آخر میں ان جیسا طباع اور ذہین فقیہ پیدا نہیں ہوا میں نے ان کے فتاویٰ کے مطالعہ سے یہ رائے قائم کی ہے۔ اور ان کے فتاویٰ انکی ذہانت، فطانت، جودتِ طبع، کمالِ خفاہت اور علومِ دینیہ میں تجربہ علمی کے شاہدِ عادل ہیں

مولانا ایک دفع جو رائے قائم کر لیتے ہیں۔ اس پر مضبوطی سے قائم رہتے ہیں یقیناً وہ اپنی رائے کا اظہار بہت غور و فکر کے بعد کرتے ہیں۔ لہذا انھیں اپنے شرعی فیصلوں اور فتاویٰ میں کبھی کسی تبدیلی یا رجوع کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بایں ہمہ انکی طبیعت میں شدت زیادہ تھی۔ اگر یہ چیز دیمال میں نہ ہوتی تو مولانا احمد رضا خاں گویا اپنے دور کے امامِ اوجہ فیقہ ہوتے (اوراق گم گشتہ ص ۱۸۵)

یہاں جی چاہتا ہے کہ حکیم ملت علامہ اقبال کی آخری وصیت کا آخری جزو یہ بھی درج کر دیا جائے جو انھوں نے جناب جاوید اقبال کیلئے تحریر کیا تھا۔

اگرچہ موضوع کے اعتبار سے اس اقتباس کی ضرورت نہیں۔ پھر بھی اس سے علامہ اقبال کے عقائد و نظریات کی بھرپور وضاحت ہو جاتی ہے۔ اور گمان ہوتا ہے کہ امام احمد رضا کے فتاویٰ کے گہرے مطالعہ کے بعد انکے یقان میں نہایت درجہ کی تابندگی ہوئی ہو۔ علامہ اقبال پر ایک دور ایسا بھی گذرا ہے جبکہ وہ فقہ کی تدوین کے متعلق بڑے اہمک سے

سوچ رہے تھے اور اسکے متعلق تقریباً تمام ضروریات و لوازمات کو بھی فراہم کر لیا تھا مگر بیماری اور عمرِ وفاتہ کر سکی۔ لہذا ان حالات میں ضروری تھا کہ حضرت علامہ فقہاء فقہ اور تاریخ فقہ سے واقف ہوتے۔ اور میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ کوئی فقیہ (غیر متعصب) امام احمد رضا اور انکی کتابوں سے اعراض نہیں کر سکتا۔

مسک المہنت اور اہل بیت کی محبت | بات تھی علامہ اقبال علیہ الرحمہ کی وصیت کی جو انھوں نے جاوید اقبال کیلئے رقم فرمائی تھی۔ تحریر فرماتے ہیں۔

باقی دینی معاملے میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے عقائد میں بعض جزوی مسائل کے سوا جو ارکانِ دین سے نہیں ہیں سلفِ صالحین کا پیروں۔ اور یہی رائے بعد کمال تحقیق کے محفوظ معلوم ہوتی ہے جاوید کو بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ وہ اسی راہ پر گامزن رہے۔ اور اسلئے بدقسمت ملک ہندوستان میں مسلمانوں کی غلامی نے جو اپنے عقائد کے لئے فرقے مختص کر لئے ہیں ان سے احتراز کرے۔ بعض فرقوں کی طرف لوگ اس واسطے مائل ہو جاتے ہیں کہ ان فرقوں کیساتھ تعلق پیدا کرنے سے دینی فائدہ ہے

میرے خیال میں بڑا بد بخت ہے وہ انسان جو صحیح دینی عقائد کو مادی منافع کی خاطر قربان کر دے غرض یہ ہے کہ "طریقہ" حضرت المہنت محفوظ ہے اور اسی پر گامزن رہنا چاہئے اور ائمہ اہل بیت کیساتھ محبت اور عقیدت رکھنی چاہئے۔ محمد اقبال ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۵ء

(اوراق گم گشتہ ص ۲۶)

نوار تلخ ترمی زن | سہ قہاری و جباری و قدوسی و جبروت۔ یہ چار عناصر ہوں تو نبیائے ملان حضرت علامہ نے "امام احمد رضا علیہ الرحمہ" کی شدت کا ذکر کیا ہے ممکن ہے حضرت علامہ کے نزدیک ان کا ارشاد صحیح ہو۔ مگر خود ہی تو فرماتے ہیں۔

نوار تلخ ترمی زن چوں ذوقِ نغمہ کم یابی

اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو امام احمد رضا کی "شدت" یا تلخ نوائی بلا وجہ نہیں تھی۔ بلکہ اس وقت انتہائی ضروری تھی۔ وہ دور انتہائی خود رائی، خود فراموشی بلکہ خود فرشی کا دور تھا۔ دور جدید کی بدنامی نے بڑے بڑے علمائے دین کہلانیاں کا رخ موڑ دیا تھا۔

خود فرشی کے اس دور میں لوگ دین اور اہل دین، اسلام اور اہل اسلام کا کھلے بندوں مذاق اڑانے لگے تھے شیخ اور علامہ کہلانیاں کے قلم اور ذہن بہک رہے تھے۔ حتیٰ کہ قرآن عظیم کی تفسیر و تعبیر بھی وقتی مصالح اور سیاسی رجحان کے تحت کی جا رہی تھی اور اس باب میں سرسید، مولانا شبلی سب سے آگے آگے تھے۔

پھر کچھ علماء کا ایک ایسا طبقہ بھی تھا جس نے عظمت مصطفیٰ اور عصمت حبیب کربار کو پامالی کر نیکی کوشش جدوجہد کی۔ ان حالات میں یقیناً امام احمد رضا کیلئے وہی درست تھا جو انہوں نے کیا۔

اگر موقع پرستی، مصلحت اندیشی اور چشم پوشی سے کام لیا جاتا تو ممکن ہے اس وقت ساری ملت ہی فرنگی اور برہمنی نظریات قبول کر چکی ہوتی اور نہ جانے کیا کیا رونما ہو چکا ہوتا۔

اور پھر یہ کہ حضرت علامہ ہی کے قول کے مطابق "عشق مصلحت اندیش نہیں ہوتا، بلکہ عشق نے مصلحت اندیشی سے کام نہیں لیا۔ امام احمد رضا کا دوسرا نام اگر عشق کہا جائے۔ تو عین درست ہوگا۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبیم دیاؤں کے دل جس سے دل جائیں وہ طوفان۔ با۔ ہو ملکہ یا لالہ تو بریشم کی طرح نرم۔ رزم حق و باطل ہو تو فو لا دے مومن

بے پناہ جرات کا مظاہرہ

اگر دشمنی کے معاملہ میں بھی امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے نہایت جرات و جواں مردی کا مظاہرہ فرمایا ہے جبکہ علمائے کرام کا ایک پورا طبقہ ہی نہیں ہندو اکثریت کی پوری قوت بھی شعائر اللہ کو مٹانے پر کمر بستہ تھی۔ ان حالات میں کسی وقت بھی ہندو اپنے برادران وطن سمیت حملہ آور ہو سکتے تھے۔ اور ملک کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی آگ و خون کا کھیل شروع کر دیا جاتا۔ مسلمانوں کو رنج کر دیا جاتا اور ان کے گھروں کو آگ لگا دی جاتی مگر آپ اور آپ کے رفقاء نے بے پناہ

جرات ایمانی کا مظاہرہ فرمایا اور اپنوں کی دہلی دہلی غراہٹوں اور بندوں کی دہکتی آنکھوں کی کوئی پردہ نہیں کی اور کسی قسم کی کوئی مصلحت سدراہ نہ ہو سکی اور وہی کہا جوتی تھا۔

۱۹۰۶ء میں ایک چھوٹی سی کتاب "الفن الفکر فی قربان البقر" رقم فرمائی جس میں نہایت عمدہ طریقہ سے ذبحہ گاؤ کو ثابت فرمایا۔ بلکہ بلا وجہ روکنے پر شرف اسلام کی اہانت و تذلیل کو مدنظر رکھتے ہوئے (گاؤ کشی کو) واجب اور ضروری قرار دیا۔

اور ان علماء کی سخت تردید فرمائی جو گاندھی جی کی ہاں میں ہاں ملائے اور برادران وطن کے نام پر ہندوؤں کی دلجوئی کرنے کی وجہ سے اسلام کی اہانت اور شوکت اسلام کو پامال کرنے کے درپے تھے۔

اس کتاب میں امام احمد رضا نے نہایت باریک بینی سے اس مسئلہ کا جائزہ لیا ہے اور گاؤ کشی کے ترک سے جس دینی، معاشی اور اقتصادی مسائل پیدا ہو نیکا امکان تھا ان کا بالوضاحت ذکر فرمایا ہے۔

خلاصہ کلام | آپ فرماتے ہیں

(۱) تو اب اصل مسئلہ کا جواب لیجئے۔ گاؤ کشی اگرچہ لتخصیص اپنے نفس ذات کے لحاظ سے واجب نہیں۔ نہ اسکا تارک باوجود اعتقاد بااحت بنظر نفس ذات فعل گنہگار۔ نہ ہماری شہرت میں کسی خاص شے کا کھانا بالیقین فرض مگر ان وجوہ سے صرف اس قدر ثابت ہوا کہ گاؤ کشی جاری رکھنا واجب لعینہ اور اس کا ترک حرام لعینہ نہیں۔ یعنی انکے نفس ذات میں کوئی امر انکے واجب یا حرام کر نیکا مقتضی نہیں۔

لیکن ہمارے احکام مذہبی صرف اسی قسم کے واجبات و محرمات میں منحصر نہیں۔ بلکہ جیسا ان واجبات کا کرنا۔ اور ان محرمات سے بچنا ضروری و جہتی ہے۔ یوں واجبات و محرمات لغیر ہاں بھی امتثال و اجتناب اشد ضروری ہے۔ جس سے ہم مسلمانوں کو کسی طرح مضر نہیں

اور ان سے بالجبر باز رکھنے میں بیشک ہماری مذہبی توہین ہے جسے حکام وقت بھی روا نہیں رکھتے۔ ہم ہر مذہب و ملت کے عقلا سے دریافت کرتے ہیں کہ

اگر کسی شہر میں بزور مخالفین گاؤں کشتی قطعاً بند کر دی جائے اور بلحاظ ناراضی ہندو اس فعل کو کہ ہماری شرع ہرگز اس سے باز رہنے کا نہیں حکم نہیں دیتی ایک قلم موقوف کیا جائے تو کیا اس میں ذلت اسلام متصور نہ ہوگی؟ کیا اس میں خواری و مغربی مسلمین نہ سمجھی جائے گی؟ کیا اسوجہ سے ہندو کو ہم پر گردنیں دراز کرنے۔ اور اپنی چہرہ دستی پر اعلیٰ درجہ کی خوشی ظاہر کر کے ہمارے مذہب اور اہل مذہب کیساتھ شہانت کا موقع ہاتھ نہ آئیگا؟ ہم پر پوچھتے ہیں کہ اس رسم سے جس میں صد ہا منافع ہیں ایک قلم امتناع آخر کسی وجہ پر مبنی ہوگا۔ اور وجہ مواضع کچھ نہیں کہ ہندو کی ہیٹ پوری کرنا اور مسلمانوں نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام انسانوں کے اسباب معیشت میں کمی ناٹنگی کر دینا ہے۔ اور اس میں ہمارے لئے ہزاروں منافع۔۔۔۔۔

(۲) مع ہذا گائے کی کھال وغیرہ سے جو ہر اہل قلم کے منافع ملتے اور ان منفعیوں میں ہندو بھی ہمارے شریک ہوتے ہیں اور چند اقوام کی تجارتیں اور ان کے رزق کے ظاہری سامان اسی گاؤں کشتی کا نتیجہ ہیں تو مسائل کا یہ قول کہ کوئی فائدہ اس فعل پر مرتب نہ ہو محض تصویر غلط ہے اور اس کی قربانی خاص ہمارے شعائر دین سے ہے۔۔۔۔۔ دَا بُدُنْ جَعَلْنَا لَكَ

مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ (اور اونٹ اور گائے کو کیا ہم نے تمہارے لئے خدا کے شعاروں میں سے) (۳) اور یقیناً معلوم کہ ہمارے ملک میں اونٹ ہماری غذا و ادائے واجب قربانی کیلئے کفایت نہیں کر سکتے۔ اول تو سخت گراں دوسرے نسبت گاؤں نہایت قلیل الوجود۔ اور اگر گاؤں کشتی موقوف کر کے اونٹ پر اکتفا کیا جائے تو چند روز میں اونٹ کی قیمت وہ چند ہو جائے گی اور یہ نفع عام جو ہمارے غریب کو پہنچتا ہے ہرگز متصور نہ رہے گا اور عجب نہیں کہ رفتہ رفتہ بوجہ قلت اونٹ حکم عنقا کا پیدا کرے

(۴) علاوہ بریں ہم دریافت کرتے ہیں اس کی تحریم ہندو کے یہاں وہی وجہ سے معقول ایک یہ کہ جانور کی ناحی ایذا اور ہتھیار ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اکثر اقوام ہندو بکری، مرغی، مچھلی کھاتے ہیں کیا وہ جانور نہیں؟ کیا انکی جان۔ جان نہیں کیا ان کی ایذا احرام نہیں۔ کیا ان کا قتل ہتھیار نہیں۔ اور خود کتب ہندو سے جو رام و لکھمن و کرشن کا شکاری ہونا ثابت اس ہتھیار کا کیا

علاج ہے؟ اور ایسا ہی ناراضی ہندو کا خیال کیجئے تو اگر وہ اس ہتھیار کے حکم کو عام کر دیں تو کیا شرع مطہر میں ہر جانور کے ذبح و قتل سے باز رکھے گی!

اور سانپ کہ انسان کی جان کا دشمن اور ہندوؤں کا دیوتا ہے ہرگز نہ مارا جائے گا۔۔۔۔۔ (۵) ایک وجہ یہ بھی ہے کہ گائے ان کے یہاں معظّم ہے اور اپنے معظّم کا ہلاک نہیں چاہتے ہم کہتے ہیں اولاً گنونا کی آنکھیں بند ہوتے ہی ان سعادت مندوں کی تعظیم کا حال کھل جاتا ہے۔ اپنے ہاتھوں چاروں کے حوالے کرتے ہیں کہ چنیں بھاڑیں۔ اور چرسا اپنے لئے بٹھرا لیتے ہیں کہ کھال کی جوتیاں بنا کر بیلین۔۔۔۔۔ اگر تعظیم ہے تو صرف گائے پر مقنصر ہے ہم بچشم خود دیکھتے ہیں کہ ہندو آپ بیل کی ہرگز تعظیم نہیں کرتے بلکہ اس پر سخت تشدد کرتے ہیں

(۶) باقی رہا مسائل کا یہ کہنا کہ اس فعل کے ارتکاب سے توران فتنہ و فساد ہوگا۔ ہم کہتے ہیں جن مواضع پر مثل بازار و شوارع عام وغیرہا گاؤں کشتی کی قانوناً ممانعت ہے وہاں جو مسلمان گائے ذبح کر لیا اللہ آثار فتنہ و فساد اس کی طرف منسوب ہو سکتی ہے۔ ورنہ قانوناً مجرم قرار پائے گا۔ اور اس امر کو ہماری شرع مطہر بھی روا نہیں رکھتی کہ ایسی وجہ سے مسلمانوں پر مواخذہ یا محض سزا ہوئے۔۔۔۔۔ اور جہاں قانوناً ممانعت نہیں وہاں اگر توران فتنہ و فساد ہوگا تو لاجرم ہندو کی طرف سے ہوگا۔ اور جرم اخص کا ہے کہ جہاں ذبح کر لیا کی اجازت ہے وہاں بھی ذبح نہیں کرنے دینے۔

(۷) بالکل خلاصہ جواب یہ ہے کہ بازار و شوارع عام میں جہاں قانوناً ممانعت ہے براہِ جہالت ذبح گاؤں کا ترکب ہونا بیشک مسلمانوں کی توہین و ذلت کیلئے پیش کرنا ہے کہ شرعاً حرام۔ اور اسکے سوا جہاں ممانعت نہیں وہاں سے بھی باز رہنا اور ہندو کی بیجا ہت بجا کھنے کیلئے ایک قلم اس رسم کو اٹھا دینا ہرگز جائز نہیں۔

اسکے ساتھ ہی دلائل و براہین کا دریا بہتا ہوا نظر آتا ہے قرآن و احادیث حکما اور عتہائے اسلام کے ارشادات سے گاؤں کشتی کو جائز اور بوجہ دیگر ضرور قرار دیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ہندوؤں کی مذہبی کتاب دید سے بھی قربانی گاؤں کا ثبوت دیا گیا ہے عرض کردوں کہ صرف امام احمد رضا علیہ الرحمہ کی کتاب پڑھ کر ہی صحیح رائے قائم کیجا سکتی ہے

مہرشدی صدر الشریعہ

امجد علی کو درس نظامی کے تمام فنون میں کافی دسترس حاصل ہے اور فقہ میں تو ان کا پایہ بہت بلند ہے۔ آپ یہاں کے موجودین میں نفقہ جیکنا نام ہے وہ مولوی امجد علی صاحب میں زیادہ پایگا اسکی وجہ یہی ہے کہ وہ استفاء سنایا کرتے ہیں۔ اور جو میں جواب دیتا ہوں لکھتے ہیں طبیعت افاز ہے طرز سے واقفیت ہو چکی ہے (امام احمد رضا علیہ الرحمہ)

یہ عجیب بات ہوگی کہ فقہ و فقہاء کا ذکر ہوا اور حضرت صدر الافاضل علیہ الرحمہ کے قول کے مطابق ”یہ اعلیٰ حضرت کے احب الخلفاء ہیں“ اور ”جو اجر دینا آپ سیکھتی ہے“ اور حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کا تذکرہ نہ آئے۔

”ذبیحہ کاؤ“ کے بارے میں آپ کا فتویٰ بھی قابل ملاحظہ ہے۔ اس سے علم و حکمت کی نہ جانے کتنی شاہراہیں کھل جاتی ہیں۔

زراعت کے بہانے سے ہندو ہماری مذہبی رسم میں نہ صرف دست اندازی بلکہ اس کا پورا انکسار دچاہتے ہیں اور طرفہ یہ کہ اس پر مذہبی آزادی استفاہ کرتے ہیں کیا مذہبی آزادی کے یہ معنی ہیں کہ ایک فریق کے خیالات کو کامیاب کرنے کیلئے دوسرے فریق کی دینی، مذہبی رسوم بند کر دی جائیں؟ ہندوستان میں روزانہ ہزاروں گائے ذبح ہوتی ہیں آج تک زراعت کو کونسا نقصان پہنچا جو آئندہ پہنچنے کی امید۔ قدرت کا قاعدہ ہے کہ جس چیز کی مانگ زیادہ ہوتی ہے اسے زیادہ پیدا فرماتی ہے۔ گاؤں کشی بند ہونے سے زراعت کو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ سوا اسکے کہ کھیت میں بڑ کر تیار کھیت کو کھا جائیو اسے اب دس ہیں تو جب ستو ہونگے

ہاں گوشت کو نقصان عظیم پہنچے گا۔ مسلمان اور عیسائی بلکہ ہندو کی بعض اقوام بھی طبعی طور پر غذائے گوشت کی عادی ہیں اسے بند کر کے صرف دال ساگ پر انھیں قانع کرنا ضرور انکی عافیت میں خلل انداز ہوگا

اور ہرگز انکی صحت جسمانی ٹھیک نہیں رہ سکتی۔ اور اسکے سوا حاجتوں کو سخت نقصان پہنچے گا۔ علاوہ ازیں ہزاروں کام جن پر چمڑے کے کاغذوں کی بنا ہے اور لاکھوں روپے کی تجارت ہے اور ہزاروں آدمیوں کا رزق۔ اور کوئی خزانے کیلئے لاکھوں کا محصول یہ سب امور کیسے بند ہو جائینگے اور ملک کی رفاہ و آسائش میں عام انقلاب واقع ہوگا جسکا ضرر نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام اقوام کو پہنچے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(رسائل رضویہ ص ۲۳۶)

حرف آخر

آج ”جمعۃ المبارک“ ۱۹ رجب ۱۴۰۲ھ ۲۴ مئی ۱۹۸۲ء کو جب میں اپنی اس کتاب ”پاک و ہند کی چند اسلامی تحریکیں اور علمائے حق“ کی آخری سطریں لکھ رہا ہوں ماضی کی بے شمار مقدس یادیں دل و دماغ کو منور کر رہی ہیں۔

غالباً ۱۹۴۲ء کا کوئی مہینہ تھا جب ہم ریں اور میرے چچا زاد بھائی مولانا مفتی غلام سلیم صاحب حال مقیم کراچی) استاد العلما حضرت شیخ الحدیث علامہ عبد المصطفیٰ صاحب الازہری مدظلہ العالی ابن صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کی زیر نگرانی دینی تعلیم حاصل کرنے کیلئے مبارکپور اعظم گڑھ کی عظیم درسگاہ ”جامعہ اشرفیہ مفتاح العلوم“ میں داخل ہوئے اور ۱۹۴۶ء تک وہاں سلسلہ تعلیم جاری رہا۔

اس وقت وہاں ”جامعہ اشرفیہ“ کے بانی حافظ الملت والدین حضرت مولانا حافظ عبد العزیز صاحب علیہ الرحمہ حضرت مولانا محمد بش اعظم پاکستان قبیلہ سردار احمد صاحب رحمت اللہ علیہ کے ہم سبق اور صدر الشریعہ کے شاگرد شیخ الحدیث تھے۔ اور حضرت علامہ عبد المصطفیٰ الازہری اور حضرت علامہ عبد المصطفیٰ صاحب اعظمی مدرّس دوم تھے۔

ان دنوں مبارکپور ہی میں حضرت علامہ ارشد انقادی، حضرت مولانا عبد المنان صاحب شیخ الحدیث، قاری محمد کبھی صاحب اور دوسرے طلباء جو انکے ہم سبق تھے اور بعد میں تقریباً سبھی شیخ الحدیث ہوئے زیر تعلیم تھے مبارکپور اعظم گڑھ کی یہ دینی درسگاہ اسوقت بھی ایک عظیم مثالی درسگاہ اور بیتا اسکی

عظمت آسانوں تک جا پہنچی ہے (الحمد للہ رب العلمین)

اس دارالعلوم کی عظمت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس نے بے شمار جید عالم اور اہل قلم پیدا کئے جنکا شمار دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انھیں دنوں حضور صدر الشریعت علیہ الرحمہ دارالعلوم میں دورہ حدیث کے طلباء کا امتحان لینے تشریف لائے، دارالعلوم کی دوسری منزل پر بڑے ہال میں امتحان ہو رہا تھا۔ عصر کے وقت امتحان ختم ہوا نماز کیلئے باہر تشریف لائے تو کسی حدیث کی سند کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ آپ نے فرمایا عید المصطفیٰ کہاں ہیں! انھیں بلاؤ متن و استاد کے بارے میں ان کا حافظہ عمدہ ہے!

اسی طرح جب ہم چھٹیوں میں گھر جاتے اور حضور صدر الشریعت موجود ہوتے تو ہم تدم بوسی حاصل کرنے میں دیر نہ کرتے۔ یہ انھیں کی دعاؤں کا اثر ہے کہ اللہ تو نے دینی بصیرت عطا فرمائی اور حق و باطل میں تمیز کرنے کا ملکہ بخشا۔

ۛ سلامی جا بجا ارض و سما دیں

تو رے خدام اے صدر الشریعت

دو خورشید پیشانی جھکا دیں

جدھر جائیں فرشتے سر جھکا دیں

(علامہ شفیع جوینوری)

تشکر و امتنان کیلئے استاذی و استاذ العلماء حافظ الحدیث دایر حضرت علامہ عید المصطفیٰ صاحب الازہری زید مجتہد العالی ادام اللہ ظلالہ شیخ الحدیث دارالعلوم امجدیہ کراچی کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ جنگی زیر نگرانی ہی سب کچھ حاصل ہوا اور اب تک ان کی کرم نوازیوں جاری ہیں۔

اور اس کتاب کے مرتب کرنے میں آپ کی نہ صرف روحانی بلکہ مادی امداد بھی حاصل رہی۔ الحمد للہ رب العلمین علی منہ وکرمہ۔

قابل مطالعہ اور ایمان افروز کتابیں

نام کتاب مقیاس سناٹوہ	نام کتاب تفسیر فیض الہی بہشتی جلد	نام کتاب نور ایمان از مولانا عبدالحکیم فرخ علی
رکن الدین بن حبیب اللہ	مراۃ شرح مشکوٰۃ عمل	حیات النبی از علامہ سید احمد سعید شاہ صاحب کلمی
خون کے آئینہ	گنج خوار اردو	سید و النبی
الاسعداد	مصابیح الیوم اردو	التبشیر مع التوبیر
مذکرہ مشائخ قادریہ	چار الحق کامل	معراج النبی
کلمات امام ربانی اردو کامل	تفسیر نور العزیز	کتاب التزویج
حسام الخرمین	مدارج النبیوت اردو کامل	تسبیح الرحمن
تہذیبی جماعت	بارہ تقریریں	الحق المبین
زلزلہ	مواعظ حضور اہل بیت	نفی الغفل
مشائخ چشت	دوم فرید	تقریر منیر
کرچا کا مسافر	قرانی مواظب اہل	الصوامع البندیہ از مولانا شمس علی خاں
الیزبت القسنت جلد	دوم	محمد رسول اللہ قرآن میں از علامہ ارشد قادری
اوراق عس	قرانی فرید	سوانح غریب نواز از ارشد قادری مشتاق احمد نظامی
تسکین الخواطر	سوم	مشکوٰۃ رسالت کے مختلف کردہ از علامہ ارشد قادری
الہدایۃ الکبیر اردو	مذکرہ اکبر بہشت	امام نعت گویاں از جناب اختر الہی
شیخ شہستان رضا کامل	تہذیبی فرید اردو	انیس الارواح از خواجہ عثمان ہارونی
شرح قصیدہ بردہ شریف	عبارت اسم کامل	آئینہ حق از مولانا ابوالفضل منظور احمد شاہ
شرح قصیدہ غوثیہ	کلمات نظم	فیوضات فریدی
کشف المحجوب اردو	نفاذی رضوی اہل تاہم	شبہات قدس
کیکبائے سلطنت	تحقیقی اہل اولیٰ چارہ	قانون شریعت کامل از مولانا شمس الدین رضوی (ذریعہ)
کوشا الخوات	مدارج نبوت (اردو)	عقائد اہل بیت بران مشتق احمد نظامی الا آباد
رکن دین کتاب الحج	مدارج الصفا اردو	الشہ احمد رضا بریلی
توضیح الایمان	شراذم القیام اردو	انفصیت صدیق اکبر از مفتی غلام سرور قادری
رسائل رضوی اہل	مذکرۃ اللہ لیلہ اردو	قہر خداوندی از مولانا حسن علی رضوی
دوم	جذب القلوب	برق آسمانی
مجموعہ رسائل کامل	احکام شریعت	ملی نجم از مولانا قلیل اشرف اعظمی
انفکات الخلق کامل	حدائق نبوت	باقی کے وقت
سیرت رسول علی	ذکر حبیب	تہذیب مومن (اردو) از جلال الدین سید علی
بعض الزمن ترجمہ تفسیر	ذکر حسین	اکابر دینہ کا کشمیری افشا از حسن علی رضوی
روح البیان (اردو)	شرح الصدور اردو	الغرائب الغیب دینی کو سے کا حکم
اہل تاہم	عزت المتقین	
الدرر السعیدہ اردو	غنیۃ الطالبین اردو	
الصواعق الموقدہ (عربی)	نفاذی افریقیہ	
ارشاد تاج فیاض (عربی)	نفاذی مقہری	
تہذیبی فریدی	نوع الغیب	
تفسیر ابن عباس علی	مقیاس و بابیت	
سیرت کاملہ (اردو)	مقیاس التور	

منے کا پتہ :- مکتبہ فریدیہ جناح روڈ ساہیوال